ABC CERTIFIED
زندگی کے ساتھ ساتھ
چہار سُو
مدیر اعلیٰ
سید ضمیر جعفری
راولپنڈی

ABC CERTIFIED

زندگی کے ساتھ ساتھ

ماہنامہ

چہارسو

راولپنڈی

جلد: دوئم: شمارہ: ۱۶: ۱۷_ نومبر: دسمبر ۹۳ء

قیمت

فی شمارہ	18 روپے
چھ شمارے	104 روپے
زر سالانہ	200 روپے

بیرون ملک
(ہوائی ڈاک سے)

امریکہ۔ کینیڈا	40 ڈالر
برطانیہ	20 پونڈ
سعودی عرب	80 ریال
متحدہ عرب امارات	30 درہم
قطر	ایضاً
شارجہ	ایضاً

پبلشر: گلزار جاوید، طابع فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

رابطہ A/ 4569 گوالمنڈی راولپنڈی فون 540579 فیکس 419040

ترتیب

مِنیٰ کی زمیں

یہ مِنیٰ کی سر زمیں ہے
یہ امینؐ کی امیں ہے
یاں چلو سمٹ سمٹ کے
یاں رہو بکھر بکھر کے
یہ زمینِ معرفت ہے
یہ زمینِ عافیت ہے
یہ فرود گاہِ انجم
محورِ طمانیت ہے
یہاں سنگ بھی نگیں ہے
یہاں ریت یاسمیں ہے
جو سکونِ جاں یہاں ہے
بخدا کہیں نہیں ہے
جسے نہر بحر ترسیں
رمِ زندگی یہیں ہے
یہ بڑی ہی روح پرور
یہ بہت ہی دلنشیں ہے
کہ امینؐ کی امیں ہے
جو مِنیٰ کی سر زمیں ہے

بشریٰ رحمٰن

کشمیری مجاہد

زندگی کی دوڑ میں خالی صدا
ہر طرف اُبھری ہوئی
آدمیت کے تقاضوں کی فضا کو روند کر
جانے کس جانب چلی ہے انتہا
کربلا کا معرکہ ہے یا کوئی جنگ و جدال
رات کی تاریکیوں میں
ہر طرف بارود ہی بارود ہے پھیلا ہُوا
کفر و ظلمت کی طنابیں کھینچ کر
آج کشمیری مجاہد دیکھ پھر آگے بڑھا
خاک و خوں میں بربریت ناچ اُٹھی
وقت کے کاندھوں پہ
پھر لاشے اُٹھے
اور تھر تھر کانپتی ہے گل زمیں
خوں مجاہد کا نہ ناحق جائے گا
وقت کی آندھی
ہر اک ظلمت اُڑا لے جائے گی
اور آزادی کا پرچم سبز
اس وادی میں پھر لہرائے گا
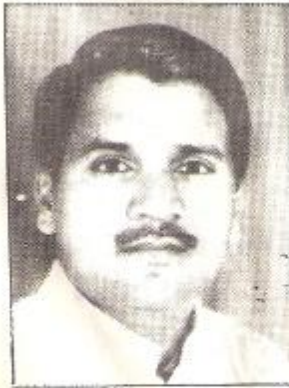
منیر جہلمی

قرطاسِ اعزاز
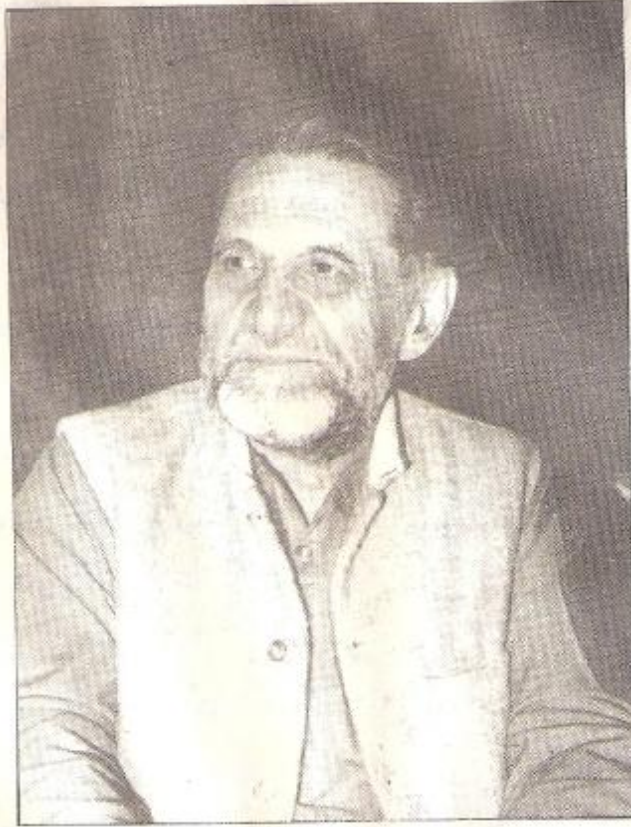
اشفاق احمد

کے نام

BIO-DATA

....

Name: Ishfaq Ahmad

Father's name: Dr. Mohammad Khan

Date of birth: 22 August, 1927

Permanent address: 121-C, Model Town, Lahore (Phone: 853640)

Education & other Training:

1) M. A. (Urdu) from Government College, Lahore.

2) Diploma in Italian from Rome University, (Italy).

3) Diploma in French from Grenoble University, (France).

4) Specialized Training in Broadcasting: New York University (U.S.A.)

5) Participation in Bread-Loaf Writers Workshop, Vermount (U.S.A.)

Position held:

1) Lecturer in Urdu in Dyal Singh College, Lahore, for two years.

2) Lecturer in Urdu in Rome University, Italy, for two years.

3) Lecturer in Punjabi (Honorary-one year) in Punjab University, Lahore.

4) Editor of weekly "Lailo Nehar" Lahore (2 years).

5) Editor/Publisher of Monthly "Dastango" Lahore (3 years).

6) Director, R.C.D. Regional Cultural Institute, Pakistan Branch (4 years).

Membership of learned bodies/institutions:

1) Member, Institute of Modern Languages, Islamabad University, Islamabad.

2) Member of the Committee of Courses in Pakistani Culture, Board of Intermediate and Secondary Education, Lahore.

3) Member of the Adult Basic Education Society, Gujranwala.

4) Member of the Board of Studies in Panjabi, Punjab University, Lahore.

5) Member, Executive Body of "Academy of letters" Islamabad.

6) Member of Anjuman Tarraqi-i-Urdu Board, Karachi.

7) Member of National Hijra Centenary Celeburations Committee, Islamabad.

8) Member of the Pak-Advisory Committee Berkely Urdu Programmes, (Berkelay University - U.S.A.)

9) Member of National Council of the Arts, Islamabad.

10) Honorary Chief Editor of Monthly "Sukhi - Ghar", Lahore.

Awards: Pride of performance in Literature in 1979.

Publications and other literary activities:

1) ایک محبت سو افسانے (Collection of short stories)

2) اجلے پھول (" " " ")

3) تاھلی تھلے (Plays in Panjabi)

4) وداع جنگ (Translation of "A Farewell to Arms" by Earnest Hamingway).

5) مہمان بہار (Novellete).

6) کھٹیا وٹیا (Collection of Panjabi Poems)

چہار سو

7) سفرینا

8) سفر در سفر

9) اور ڈرامے T.V.Plays

10) نوری کہانی T.V.Plays

11) ننگے پاؤں LongPlaysT.V

12) اچے برج لاہور دے

13) قلعہ کہانی

14) پھلکاری

T.V.Programmes.

1) Writer/Director ٹالی تھلے (A maiden Panjabi serial of Pakistan Television which ran for 6 months at Lahore T. V. Station).

2) Writer/Director شہر کنارے
(Weekly serial: 13 episodes).

3) Writer/Director اچے برج لاہور دے
(Weekly serial spread over 52 weeks)

4) Writer/Director کاروان سرائے
(Weekly serial with 13 episodes).

5) Writer حیرت کدہ
(Weekly serial:[illegible]episodes).

6) Writer قصہ کہانی
(Weekly serial: 13 episodes).

7) T. V. Vaudville میلہ ٹی وی دا
(conducted as Master of ceremony).

8) Music Programme on T. V. نکھار
(Fortnightly serial for 6 months)

9) 26 full length dramas series ایک محبت سو افسانے

10) Another most popular & highly controversial series of 26 dramas. اور ڈرامے

11	توتا کہانی	Series
12	سن چلے کا سودا	Serial

Radio Programmes:

1) 48 full length Radio Plays and
2) 329 features, skits and playlets)

3. Writer/Producer and Major Stock character of the most popular weekly feature programme "TALQEENSHAH", being broadcast for the last 16 years from all the major Stations of Radio Pakistan.

Language:
(In order of Command)

Panjabi - Urdu - English - Italian - French.

Countries visited:

USA, UK, France Spain, Italy, Germany, Austria, Belgium, Holland, Lebanon, Iran, China, Turkey, Saudi Arabia.

نجانے کیوں ہم نے علم و ادب کو غیر اہم جان کر ثانوی حیثیت میں رکھا ہوا ہے ہمارے بڑے بڑے نامور اہل قلم اور عالمی پائے کے تخلیق کار خواہش کے باوجود خود کو بنی نوع انسان کی فلاح کے لئے وقف کرنے کی بجائے تلاش معاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔

ان کے وہ بیش قیمت لمحات جن سے وطن اور اہل وطن کی سرخروئی اور سرفرازی وجود میں لائی جا سکتی ہے جن کے طفیل گلشن کی آبیاری کا سامان کیا جا سکتا ہے جن کی بدولت نئی نسل کو ذہنی کشادگی اور بالغ نظری کی منزل پر ڈالا جا سکتا ہے جن کو کام میں لا کر کھوئی ہوئی منزل پائی جا سکتی ہے بہت کچھ کیا جا سکتا ہے مگر ------- کچھ بھی تو نہ ہوا ------- اس کا ذمہ دار کون ہے۔ چھوٹیے اس قضیئے کو اگر ہم آبرو مندانہ طور پر زندہ رہنا چاہتے ہیں تو ہمیں جلد بہت جلد بلکہ فوراً اس مسئلے پر خصوصی توجہ دینا ہوگی۔

بلاشبہ اشفاق احمد صاحب نے ادب سے ہٹ کر جتنا بھی کام کیا۔ وہ بھی کسی کارنامے سے کم نہیں مگر ہماری ناچیز رائے میں وہ اوّل آخر ایک ادیب ہیں ان کی گاڑی کا ادب کی پٹڑی سے اترنا ان کی خواہش نہیں مجبوری کا باعث ضرور رہا ہوگا۔ وہ مجبوری کیا ہو سکتی ہے -------- یہ میں بھی جانتا ہوں اور آپ بھی تو پھر --------- ہمارے حق میں یہی مناسب ہوگا کہ ادب کے تمام اشفاق احمد صاحبان کو جس طرح بھی ممکن ہو سکے ہر قسم کی معاشی جکڑ بندی سے آزاد کر دیں۔

☆..... بیشتر انٹرویوز میں آپ اپنے ادبی کیریئر کی ابتدا رسالہ "علم الوقیع" کو بتاتے ہیں یہ بات قرین قیاس نہیں کہ ایک نو عمر بچہ بلا کسی شوق و تجربہ کے ادبی رسالہ نکال بیٹھے جبکہ گھریلو ماحول بھی ادبی نہ ہو ہمارے خیال میں یہ شوق کی انتہا تھی ہم ابتداء کے بارے میں جاننا چاہیں گے؟

☆..... رسالہ "علم الوقیع" میں نے ساتویں جماعت میں نکالا تھا۔ اس لفظ کے معنی نہ مجھے جب معلوم تھے نہ اب معلوم ہیں۔ میرے ایک بزرگ یہ ترکیب (علم الوقیع) اپنی گفتگو میں استعمال کرتے تھے۔ مجھے اچھی لگی میں نے اپنے رسالے کا نام رکھ دیا۔ میرے رسالہ علم الوقیع کا صرف ایک ہی شمارہ "شائع" ہو سکا کیونکہ میں ہی اس کا کاتب میں ہی مضمون نگار میں ہی مصور اور میں ہی اس کا دفتری تھا۔ اس میں بیشتر "مضمون" میرے تھے۔ نظمیں غزلیں قینچی سے کاٹ کر چپکائی گئی تھیں۔ تصویر زیادہ تر رسالہ عصمت' تہذیب نسواں اور خاتون بمبئی سے لی گئی تھیں۔ پرنٹ لائن یہ تھی: بہ اہتمام لالہ موتی رام کے امرت الیکٹرک پریس میں چھپا اور اشفاق احمد نے موضع مکتر سے شائع کیا۔

☆..... ابتدا میں آپ شاعری کی طرف مائل رہے بعد میں افسانے اور ڈرامے کی طرف متوجہ ہو گئے سفرنامہ میں بھی انفرادیت کو نمایاں رکھا یہ سب کچھ ارادی تھا یا حالات کے تحت ایسا ہوا؟

☆..... دونوں ہی چیزیں تھیں۔ اراداتاً بھی ادیب بننا چاہتا تھا اور حالات بھی مجبور کر رہے تھے۔ میری بڑی آپا اور بڑے بھائی پڑھنے لکھنے سے گہرا شغف رکھتے تھے ان کے پاس بہت سے رسالے اور اخبار آتے تھے جن میں مشاہیر کی تحریریں ہوتی تھیں۔ میں ان کی گھن گرج سے بہت متاثر ہوتا۔ خاص طور پر جب میری آپا بھائی جان کو اور بھائی جان آپا کو مولانا ظفر علی خان کی نظمیں اور مولانا ابو الکلام آزاد کی نثر پڑھ کر سناتے۔ میرے اندر ذاتی تخلیقی صلاحیت کوئی خاص نہیں اسی لئے میں نے ہر صنف کی طرف منہ مارا اور ہر جگہ ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ بات جو عظیم رائٹرز کا طرہ امتیاز ہے وہ میری گرفت میں نہ آسکی۔ ابتدا میں میرا ایک افسانہ مشہور ہو گیا اور اسی کے زور پر یار لوگ مجھے کھینچ کر یہاں لے آئے کہ اب میرا گوشہ شائع کیا جا رہا ہے۔ اس سے زیادہ پرسکون' خوش گوار اور Rewarding بات اور کیا ہوتی کہ میں پورا ادیب نہیں اور مجھے اتنا بڑا اعزاز عطا کیا جا رہا ہے۔

☆..... آپ کا ادبی سفر کم و بیش پانچ دہائیوں پر مشتمل ہے کیا آپ کسی ایک دہائی کا تعین کر سکتے ہیں جس میں بھرپور اور مثبت ادب تخلیق کیا ہو؟

☆..... اس بات کا جواب تو کوئی نقاد ہی دے سکتا ہے۔ البتہ اتنی بات میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ شروع شروع میں میں نے ادب تخلیق کرنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد ادب اور تخلیق دونوں کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ درمیان میں میں نے اکی دکی اور ٹوٹی ٹوٹی کئی کوششیں کیں لیکن گوہر مقصود ہاتھ نہ آیا۔

☆..... آپ نے کم و بیش تیس برس میڈیا کی نظر کئے اس دوران ادب کی طرف آپ کی توجہ کم کم رہی کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ نے اردو ادب کی اس حق تلفی کا ازالہ کر دیا؟

☆..... میڈیا کی طرف میرا دھیان گھر گرہستی کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے کارن ہوا لیکن وہاں بھی مجھے وہ مقبولیت اور قبولیت حاصل نہ ہو سکی جس کا تصور باندھ کر میں وہاں گیا تھا۔ میرے ڈرامے ہر شخص کے سر پر سے گزر گئے۔ موضوعات کو اجنبی اور انداز کو تھکا دینے والا قرار دے کر انہیں ناپسندیدگی کے گڑھے میں ڈال دیا گیا۔ مکالموں کی طوالت اور "فلسفے" کی بھرمار سے ناظرین / سامعین تنگ آ گئے اور بالآخر مجھے اس صنف سے بھی جزوی طور پر الگ ہونا پڑا۔ میں ٹی وی کا وہ واحد مصنف ہوں جس کے کسی سیریل یا سیریز کا کوئی وڈیو تیار نہیں ہوا (اس لئے کہ مانگ نہیں) میرے ڈراموں کی چونکہ Viewing بہت محدود ہے اس لئے سپانسر انہیں اپنے اشتہاروں سے بھی نہیں نوازتا۔

اب میں عمر کے اس حصے میں ہوں کہ اپنے لئے کوئی تیسری راہ تلاش نہیں کر سکتا۔ چونکہ لکھنے لکھانے کا ایک نائی چور ہوں اس لئے تحریر کی ہیرا پھیری سے بھی نہیں نکل سکتا۔ اب یہ آخری وقت ہیرا پھیری میں گزر رہا ہے۔

☆..... آپ کی اپنے بارے میں یہ رائے کہ دوسروں کے مقابلے میں آپ کا ڈویلپمنٹ پراسس تیزی اور شدت سے ہوا ——— اس کے اسباب کیا تھے؟

☆..... اصل میں میں خوش قسمت تھا۔ نوکریاں بدلیں۔ سفر کئے۔ نئے نئے کلچر اور مختلف کراس سیکشن آف سوسائٹی میں دور دور تک گھوما پھر حضرت سائیں صاحب نور والے کے ڈیرے پر تقریباً ساڑھے گیارہ برس گزارے۔ تجسس' تشکیک' طرب' تحیر' مایوسی ہر طرح کے موسموں سے لطف اٹھایا۔ ملا بن کر وقت نہیں گزار سکا! نہ دینی ملا نہ سائنسی ملا نہ سیاسی ملا۔ اس لئے تیزی کے ساتھ تبدیلیوں سے گزرا۔ اس وقت

حضرت علامہ کی ایک چیز یاد آگئی کہ

چہ کنم کہ فطرت من بہ مقام در نہ سازد
دل ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے
چو نظر قرار گیرد بہ نگار خوب روئے
تپد آں زماں دل من پئے خوب تر نگارے

★....ایک وقت تھا کہ آپ بانو قدسیہ کے متعلق ازراہ مذاق کہا کرتے تھے کہ وہ میرے جملے چرا کر اپنی تحریروں میں شامل کرتی ہیں آج کل آپ کہتے ہیں کہ لوگوں کا خیال ہے کہ بانو قدسیہ مجھے مضامین لکھ کر دیتی ہیں اس تضاد سے آپ کا قاری کنفیوژن کا شکار ہے؟

☆....ایسے سوال عام طور پر تفنن طبع کے طور پر کئے جاتے ہیں اور ان کا لیول خواتینی پرچوں کے کالم "ہماری ڈاک" کا سا ہوتا ہے۔ کچھ لوگ ہنس لیتے ہیں کچھ خوش ہو جاتے ہیں کچھ سادہ لوح ایسی باتوں کو سچ مان لیتے ہیں۔ ایک سنجیدہ قاری کو اچھی طرح سے علم ہوتا ہے کہ یہ کس کی تحریر ہے اور اس کے اندر کس کا مزاج چھلک رہا ہے۔ ادب کا قاری کبھی کنفیوژن کا شکار نہیں ہوتا تماش بین البتہ لطف اندوزی کے ساتھ ساتھ سٹپٹایا سا بھی رہتا ہے۔ اس کو کنفیوژ ہی رہنا چاہئے کیونکہ یہ اس کا حق ہے۔

★....آپ کے خیال میں اردو ادب نے اب تک کتنے عالی پائے کے ادیب پیدا کئے؟

☆....اردو ادب نے اپنی مختصر سی عمر میں بہت ہی اعلیٰ پائے کے ادیب پیدا کئے ہیں جن میں افسانہ نگاروں کا رتبہ بہت ہی بلند ہے۔ میرے خیال میں اردو افسانہ دنیا کے دوسرے "دختر خان ادب" سے اگر سربلند نہیں تو اس کے پار کا ضرور ہے۔ پرانے افسانہ نگاروں کے ساتھ ساتھ بعد کے آنیوالے افسانہ نویسوں نے بھی ایسی غضب کی کہانیاں لکھی ہیں اور لکھ رہے ہیں کہ عقل دنگ ہوتی ہے۔ نئے افسانہ نگاروں میں میرے ذاتی اندازے کے مطابق ' خواتین افسانہ نگار بہت آگے ہیں اور انہوں نے بہت ہی خیال انگیز کہانیاں لکھی ہیں۔

ہمارے یہاں اگر کوئی کمی ہے تو Essay کی ہے۔ ابتدا میں سر سید اور ان کے ساتھیوں نے اس کی طرف بطور خاص توجہ دی تھی لیکن ان کے بعد کے ادیب اس بوجھ کو اٹھا نہیں سکے۔ مضامین کی کمیابی سے اردو ادب کا دامن ابھی تک خالی ہی ہے۔ پورے طور سے خالی نہیں تو ہولا ضرور ہے۔

★....آپ کے بارے میں ایک رائے یہ پائی جاتی ہے کہ آپ گاڑی کا پہیہ آگے کے بجائے پیچھے کی طرف گھمانے کی کوشش میں مصروف ہیں یعنی سائنسی ترقی کے جدید ترین اور تیز ترین دور میں پیروں فقیروں اور ملا ازم کا پرچار کر رہے ہیں مثال کے طور پر آپ کے ٹی وی پلے سائیں اور سائیکٹریسٹ کا نام لیا جا سکتا ہے؟

☆....میں روایتی کہانیوں کا وہ ذمہ دار لڑکا ہوں جسے معلوم ہے کہ آگے پل دھڑا دھڑ جل رہا ہے اور تیز رفتار گاڑی چلی آرہی ہے۔ میں دونوں ہاتھ پھیلا کر پٹری کے درمیان کھڑا ہوں اور چلا چلا کر کہہ رہا ہوں "گاڑی روکو گاڑی روکو۔ آگے پل جل رہا ہے" اور عازم سفر سواریاں جھلا جھلا کر کہہ رہی ہیں اس بیوقوف اور احمق دیہاتی کی آواز پر کان نہ دھرو یہ ترقی کا دشمن اور پسماندگی اور حرکت کا بیری ہے! ---------

میری ساری انسانیت سے درد مندانہ درخواست ہے اور دست بستہ اپیل ہے کہ چونکہ ترقی کی اس گاڑی کو ہر حال میں روح کے پل پر سے ہو کر گزرنا ہے اور روح کا پل جل رہا ہے پہلے اس پل کا بندوبست کر لیں۔ ہم نے ذرے کا جگر چیر کر ایٹم کے اندر کا راز تو معلوم کر لیا اب روح کے ایٹم کا تجزیہ اور بھی ضروری ہو گیا ہے ساری سائنس اور ساری ٹیکنالوجی انسان کے لئے اور انسان کی فلاح کے لئے تخلیق کی گئی ہے۔ لیکن اگر سائنس اور ٹیکنالوجی کے مقابلے میں انسان کو اور اس کی روح کو اور اس کی اندرونی طلب کو کوئی اہمیت نہ دی گئی تو پھر اس ساری "ترقی" اور "پیش روی" کا بڑا ہی خوفناک نتیجہ نکلے گا -------- اگر انسان ظالم ہے' مکار ہے جھوٹا ہے اور بے انصاف ہے اور وہ بوسینا میں انیائے کا بیج بو کر سائنس اور ٹیکنالوجی کے زور پر چاند میں پہنچ گیا ہے کہ چاند کی سرزمین میں اپنے اعمال اور افکار کی کاشت کرے تو اس کی بوئی ہوئی فصل بوسینا کی کاشت سے کس طرح مختلف ہوگی۔

اس مادی دنیا میں روس کی گاڑی کا پہیہ اپنے پورے زور پر امریکا اور مغربی ممالک کی مشترکہ سائنس اور ٹیکنالوجی سے بھی آگے نکل گیا تھا۔ مجھے چونکہ روس سے بے پناہ محبت تھی اس لئے میں اس کی تیز رفتار گاڑی کے آگے دونوں ہاتھ پھیلا کر چیختا رہا چلاتا رہا کہ آگے پل جل رہا ہے۔ بھانبڑ مچ رہا ہے۔ ذرا ٹھہر جاؤ۔ ذرا رک جاؤ کہیں تمہارا نقصان نہ ہو جائے۔ کوئی حادثہ رونما نہ ہو جائے -------- لیکن روس اپنی تیز رفتاری میں بہت آگے نکل گیا۔

میں اصلی ادیب تو نہیں بن سکا لیکن ایک جھوٹا رول تو کب کا

اختیار کئے بیٹھا ہوں۔ میں اسی جھوٹے رول کے زور پر عمر بھر چیختا رہوں گا' چلاتا رہوں گا۔ واسطے دیتا رہوں گا کہ پہلے پل کی مرمت کر لیجئے پل ٹھیک کر لیجئے۔ روح کی پٹڑی استوار کر لیجئے پھر چاہے جس سپیڈ پر دل کرے آگے نکل جایئے۔ میں قربان! میں نہ آپ کے پہیے کے خلاف ہوں نہ گاڑی کے نہ ترقی کے خلاف ہوں نہ تیزی رفتاری کے۔ بس ایک توجہ چاہتا ہوں کہ چونکہ اس پل پر سے گزرنا لازمی ہوگیا ہے اس لئے پہیہ روک کر پہلے پل کا معائنہ کر لیں۔

پیر فقیر اور ملا' ہم پڑھے لکھے' دانشوروں' بیوروکریٹوں' یو این او کے نمائندوں اور وہائٹ ہاؤس کے ترجمانوں کے مقابلے میں ضرور کثیف اور آلودہ لوگ ہوتے ہیں لیکن وہ اپنے اپنے علاقے کی بیشتر آبادیوں کی روحانی ضرورتوں کو اپنی پرانی روش اور اپنی لوک دانش سے پورا کرتے رہتے ہیں۔ ساتھ ساتھ ان کو جینے کا حوصلہ بھی بخشتے رہتے ہیں ----- جب تک روح کی پرورش کا کوئی بہتر طریقہ اور بہتر سلیقہ اور مذہب سے زیادہ مہربان اور تصوف سے زیادہ حقیق پیدا نہ ہو جائے یا آپ کو مل نہ جائے تب تک بے اختیاری کے عالم میں صرف "موجود" کے سپرد ہو کر زندگی بسر کرتے چلے جانا میرے نزدیک کافی نالائق فیصلہ ہے۔

میرے ڈرامے "سائیں اور سائیکاٹرسٹ" کو ایک مرتبہ پھر دیکھیں اور ساتھ کچھ دوستوں کو بٹھا کر بھی دکھائیں۔ پھر آپ جو فیصلہ کریں مجھے منظور ہوگا۔

پہلے پہل جب گلیلو نے کہا "زمین گھومتی ہے" تو سب نے پکڑ کر اسے مارا کہ گدھے کے بچے! اگر زمین گھومے تو ہم گر نہ پڑیں۔ ہمارے رخ نہ بدلتے رہا کریں۔ ہمارا سر نہ چکرانے لگے۔ جب وہ نہ مانا تو اس کو پکڑ کر جلتی چتا پر بھسم کرنے کے لئے لے گئے پھر وہ ڈرا اور رو دیا!

★.....کچھ لوگوں کا یہ خیال بھی ہے کہ آپ Delusion of grandeur میں مبتلا ہیں اور اردو ادب میں اسی مقام و مرتبہ کے متمنی ہیں جو انگریزی ادب میں شکسپیئر کو حاصل ہے

☆.....یہ ایک چھوت کی بیماری ہے جو تقریباً سارے فنکاروں میں ہوتی ہے اور اس وبا کا چلنا سارا سال ہی رہتا ہے۔ اس کے خطرناک مریض وہ انکساری بھی ہوتے ہیں جو بظاہر عاجزی' انکساری اور بیچدانی کا اظہار کرتے رہتے ہیں اور اندر اپنی انا کے تاج محل کو صبح و شام پالش کرتے رہتے ہیں۔ یہ بیماری عام ہے اس کو ہم ادب کی زبان میں "تعلّی" کہتے ہیں۔ جو ادیب اپنے نام کو اور اپنی ذات کو اخفا میں رکھ کر لکھتا ہے اور عمر بھر اپنا آپ ظاہر نہیں ہونے دیتا وہ اس سے مبرا ہو سکتا ہے لیکن جو ایک مرتبہ رونمائی کی کرسی پر بیٹھ گیا تو اس Delusion میں مبتلا ہو گیا۔ اب میں کیا کروں!

★.....ایک تاثر یہ بھی ہے کہ آپ جس بلیغ انداز میں مسائل کی نشاندہی کرتے ہیں ان کا حل یا ان مسائل کے ذمہ دار لوگوں کی نشاندہی سے کتراتے ہیں؟

☆.....ادیب کا کام مسائل کی نشاندہی کرنے تک ہوتا ہے وہ مسائل کے ذمہ دار لوگوں کی طرف اشارے بھی کرتا ہے لیکن اس کا انداز محتسب سے اور ایڈیٹوریل رائٹر سے مختلف ہوتا ہے۔ ادیب کسی خاص فیوڈل لارڈ کے خلاف نہیں لکھے گا وہ "فیوڈل ازم" کے زہر کی نشان دہی کرے گا۔ یہ فیوڈل ازم چاہے خود ادیب میں ہو یا شاعر میں' فلمی میں ہو سوشلسٹ لیڈر میں ہو' دینی راہنما میں ہو ادیب اس کے ہمہ گیر ضرر سے آشنا کرے گا تاکہ پڑھنے والا مختلف گرہوں میں اس مزمن مرض کو تلاش کر سکے۔ (خود اپنی ذات میں جھانک کر اپنے فیوڈل لارڈ سے متعارف ہو سکے) لیکن اس کے مقابلے میں ایک سیاستدان' صحافی اور محتسب ایک مخصوص گروہ کو فیوڈل ازم کا نمائندہ قرار دے کر اسے چٹی سے پکڑ کر سب کے سامنے پیش کرے گا کہ بس یہی خرابی کی جڑ ہے باقی سب خیریت ہے۔ اسے پتھر مارو۔ میں ٹھیک ہوں اور میں ہی سچا ہوں۔

★.....آپ کی زندگی میں تصوف کا بہت دخل ہے جبکہ آپ کے انتہائی قریبی دوست قدرت اللہ شہاب مرحوم جنہیں آپ بانو قدسیہ اور ممتاز مفتی بزرگ مانتے ہیں وہ تصوف کے حق میں نہ تھے ان کا کہنا تھا کہ تصوف محض کنڈر گارٹن کی حیثیت رکھتا ہے؟

☆.....ممتاز مفتی' بانو قدسیہ اور میں شہاب صاحب کو بزرگ مانتے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ قدرت اللہ شہاب میرا دوست بھی تھا اور دوستی میں کچھ چھوٹ ایسی بھی مل جاتی ہے جو عام حالات میں نہیں ملتی۔

شہاب صاحب تصوف کے زبردست قائل تھے اور انہی کی بدولت ہم کو اس راہ کی چنک گی (گو منزل ہماری قسمت میں نہ تھی) وہ اسی کے سہارے اور اس سیڑھی (تصوف) کے راستے شرع شریف تک پہنچے۔ واقعی تصوف دین کا کنڈر گارٹن ہے۔ یعنی جب تک آپ پرائمری میں داخل نہیں ہوں گے میٹرک نہیں کر سکیں گے۔ کچھ خوش نصیب البتہ ایسے ہوتے ہیں جو پرائمری پاس کئے بغیر سیدھے بڑی جماعت میں داخل ہو جاتے ہیں وہ بہت ہی قسمت والے ہوتے ہیں۔ ان کا تانا سیدھا ل

جاتا ہے۔ وہ پہلی رکعت سے ہی خضوع و خشوع کے راستے دین کے عمل میں صحیح طریق سے شامل ہو جاتے ہیں۔ آخری منزل وہی ہے جو شارع اسلام نے متعین کی ہے۔ اب راستہ طے کرنے والا کسی کا ہاتھ پکڑ کر مسافت طے کرے یا سیدھے سبھاؤ کر لے یہ اس کی اپنی برات ہے۔ اپنی اپنی قسمت ہے اپنا اپنا لہنا ہے۔

شہاب صاحب کا تصوف سے وابستگی کا علم ان کی کتاب "شہاب نامہ" پڑھ کر بخوبی ہو جاتا ہے۔ اسے توجہ سے پڑھیے اور ان پر گزری ہوئی منفرد واردات کا خصوصی مطالعہ کیجئے۔

★....علم کے بارے میں آپ کی رائے واضح نہیں مثلاً آپ فرماتے ہیں کہ آج تک کسی ان پڑھ نے پاکستان کو نقصان نہیں پہنچایا کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ فساد کی جڑ علم یا صاحب علم لوگ ہیں.

☆....اس موضوع پر میں کئی بیان کئی جواب اور بہت سے جواب دعوے رقم کر چکا ہوں جو یقیناً آپ کی نظر سے گزرے ہوں گے عرض یہ ہے کہ ایک علم غیر نافع ہے اور ایک علم نافع۔ حضورؐ نے علم نافع حاصل کرنے کی دعا فرمائی ہے اور ہمارے دین میں علم نافع ہی علم قرار پایا ہے۔ جس سے مخلوق خدا کو فائدہ پہنچے اور جس کی بدولت انسانوں میں آسانیاں تقسیم کی جا سکیں ---- اگر تو آج کے صاحبان علم بوسنیا میں صومالیہ میں کشمیر میں فلسطین میں آسانیاں تقسیم کر رہے ہیں تو پھر تو ہمیں یہی علم حاصل کرتے رہنا چاہیئے لیکن اگر یہاں کوئی خرابی واقع ہو رہی ہے تو اس پر غور ضرور کرنا چاہیئے اور اگر اس سے پلٹنے کی ضرورت ہے تو پھر پلٹنا بھی ضرور چاہیئے۔

میں تو نہیں کہتا البتہ لوگ مل جل کر کئی مرتبہ بیورو کریسی - سیاست دانی، تھانے کچہری، ہارس ٹریڈنگ، بوٹی مافیا وغیرہ کا ذکر کرتے ہیں تو میں ان کو منع کرتا ہوں کہ آپ علم کی تذلیل نہ کریں یہ سارے پڑھے لکھے لوگ ہیں اور ملک اور قوم کا سرمایہ ہیں۔ ان کی بجائے ان لوگوں کی ندا کریں جو ان پڑھ ہیں اور کھیتوں کھلیانوں فیکٹریوں، سڑکوں شاہراہوں، وغیرہ میں کام کرتے ہیں اور جن کی نااہلی کی بدولت ساری دنیا، پورا کرہ ارض معیبت کی دلدل میں پھنسا ہوا ہے۔

علم نافع بہت بڑی دولت ہے اور صاحب علم ہونا اس کائنات کی سب سے بڑی سعادت ہے۔ میرے بابا جی سائیں نور والے فرمایا کرتے تھے کہ "صاحب علم وہ ہوتا ہے جو مشکل کے وقت جماعت میں سب سے آگے ہو اور جب انعام تقسیم ہونے لگے تو جماعت میں سب سے پیچھے ہو"

★....تہذیب و ثقافت کے بارے میں بھی آپکا نظریہ مبہم ہے آپ معاشرتی برائیوں مثلاً سرعام پان کی پیک یا نسوار تھوکنا سگریٹ بیڑی سے آلودگی پھیلانا نظم و ضبط کی پابندی نہ کرنے کو ثقافت گرداتنے ہیں؟

☆....کاش یہ سوال بنانے سے پیشتر آپ نے کسی ماہر معاشریات سے رجوع کر لیا ہوتا۔ تہذیب و ثقافت کسی ایک انسانی گروہ کے اس اجتماعی افعال و کردار کا نام ہے جس کے فریم ورک میں رہ کر وہ دوسرے گروہوں کے دور نزدیک زندگی کے عمل سے گزر رہا ہوتا ہے۔ اس میں اچھائی برائی، خوبی خرابی کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مثلاً انگریز اپنے کام کے حصول کے لئے "کیتھو" لگاتا ہے۔ اطالوی بالکل نہیں لگاتا۔ اس میں اچھائی برائی کی بحث نہیں۔ کلچر کے اختلاف کی نشان دہی مطلوب ہے۔

یہ میرا ایک درسی لیکچر تھا جس کا آپ نے حوالہ دیا۔ میں نے طالبعلموں سے کہا تھا کہ پان کی پیک دیواروں پر پھینکنا۔ راہ چلتے آوازیں کسنا۔ نسوار کی پچکاریاں چھوڑنا۔ پیار سے گندی گالیاں دینا ہماری بود و باش کا ایک بیّن حصہ ہے۔ یہ ہمارے کلچر کا ایک نمایاں پہلو ہے۔ میں اس وقت خرابی کی بات نہیں کر رہا جو "ہے" اس کا ذکر کر رہا ہوں۔ جب کبھی حفظان صحت کے حوالے سے یا اخلاقیات کے رشتے سے بات ہوگی اس وقت میں اس بود و باش کے بین حصے پر ایک اور زاویے سے روشنی ڈالوں گا۔ میں "اچھا کیا" اور "برا کیا" کی بات نہیں کر رہا جو موجود ہے اس کا ذکر کر رہا ہوں -----

میرا خیال ہے اس بیان کی رپورٹنگ میں کچھ غلطی ہو گئی جس کا آپ کی طبیعت پر بوجھ پڑا۔

★....آپ نے بیٹھے بٹھائے علامہ اقبال کو دو حصوں میں تقسیم کیوں کر ڈالا یعنی آپ کہتے ہیں کہ میں دن کے اقبال کی نسبت رات کے اقبال کا زیادہ مداح ہوں؟

☆....ہر بڑے آرٹسٹ اور ہر بڑے تخلیق کار کے اندر Paradox کا رویہ موجود ہوتا ہے۔ ایک طرف وہ تعقل کا گرویدہ ہوتا ہے اور فکر و دانش کے سہارے تخلیقی عمل میں اترتا ہے دوسری جانب وہ تخیل اور جذبے کے زور پر اپنی تخلیق میں قوس قزح کی اڑان سموتا ہے۔ اس اڑان میں اسے زندگی کے مناظر اور بھی صاف دکھائی دیتے ہیں۔ ایک رات ایسے ہی سرسری طور پر پیام مشرق کا مطالعہ کرتے ہوئے میرے دل پر یہ بات گزری کہ حضرت علامہ بھی کیا خوش نصیب انسان تھے کہ

کشف و الہام کا زر اسکے سینے پر سے ٹھاٹیں مارتا ہوا گزر جاتا تھا اور وہ عقل کو چراغ راہ بنائے بغیر اپنی منزل تک پہنچ گئے تھے۔ پھر مجھے ان کے خطبات کا خیال آیا جو انہوں نے بڑی عرق ریزی سے دقیق حوالہ جات کی روشنی میں مرتب کئے تھے اور اسلامی فلسفے کی ان باریکیوں کو ایسے سلیقے سے بیان کر گئے تھے کہ تہذیب نوی کے ہر فرزند نے انہیں دل و جان سے پسند کیا تھا۔ ان کی شاعری سراسر عشق نظر آئی اور ان کے لیکچر عقل و خرد کی قابل عمل دستاویز۔ میرے ذہن میں دونوں پلڑے ترازو کے تول تل گئے اور میں جذباتی طور پر شاعری والے پلڑے کے زیادہ قریب آگیا۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ جب حضرت علامہ واردات و کیفیات سے گزرتے ہیں تو ان کا ایک انوکھا رنگ ہوتا ہے۔ اور جب وہ فلسفے کی گتھیاں سلجھاتے ہیں تو ایک دوسرا پہلو ہوتا ہے -------- میری طرح اور بہت سے لوگ عشق والے اور جذبے والے شاعر اقبال کو جانتے ہیں اور اسی کی محبت میں مبتلا ہیں۔ اسی محبت کے راستے وہ خطبات والے حضرت علامہ تک پہنچتے ہیں۔ وہ تو شاید نہیں لیکن میں ضرور سوچتا ہوں کہ اگر حضرت علامہ نے ایک فلسفی کی حیثیت سے صرف لیکچرز لکھے ہوتے تو ان کا مقام کیا ہوتا اور اگر صرف شاعری کی ہوتی تو ان کی عظمت کس طرح کی ہوتی۔

• بہرکیف یہ میری ایک سوچ بلکہ میری ایک کیفیت ہے اور ایسی کیفیت میں مبتلا ہونا آئین جمہوریت کے خلاف نہیں ہے اس لئے آپ مجھے آسانی سے معاف بھی کر سکتے ہیں۔

★.... گذشتہ دنوں ایک خبر نظر سے گزری جس میں آپ نے سفیر یا سینیٹر بننے کی خواہش کا اظہار کیا تھا آپ کا یہ مطالبہ اپنی ذات تک محدود ہے یا آپ ملک کے ممتاز اہل قلم کو اس اعزاز کا مستحق گردانتے ہیں؟

☆.... اس خبر کی رپورٹنگ بھی ادھوری رہ گئی۔ ان دنوں صدر پاکستان کی سیٹ خالی ہونے کی بھی افواہ تھی تو میں نے اپنے آپ کو سب سے پہلے صدر پاکستان بننے کے لئے پیش کیا۔ اور اس اعزاز سے رہ جانے کی صورت میں سفیر اور سینیٹر کی آسامی کو ہی منظور کر لیا لیکن ہمارے یہاں چونکہ طنز و مزاح سے لطف لینے کا خانہ خالی ہے اس لئے آپ کی طرح اور لوگوں کو بھی یہ بات پسند نہ آئی۔ بہرکیف میں نے ان تینوں ملازمتوں کو حاصل کرنے سے پہلے ہی اپنا استعفیٰ گزار کر دیا ہے۔ امید ہے منظور ہو جائے گا۔ لیکن میرے خیال میں اگر ملک کے صدر، سفیر اور سینیٹر ادیبوں سے چنے جائیں تو وہ ملک و قوم کے لئے بہتر ثابت ہو سکتے ہیں۔

واللہ اعلم

★.... اگر ادیب یا شاعر کسی نظریے سے شدید وابستگی رکھتا ہو تو اس کی حیثیت اور تخلیق کو غیر جانب دار تسلیم کیا جا سکتا ہے؟

☆.... مغربی ادب کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد یہ احساس ہوا کہ عیسائیت سے شدید وابستگی کے باوصف وہاں کے شاعر اور ادیب اپنے آپ کو اور اپنی تخلیق کو غیر جانب دار اور لبرل شمار کرتے ہیں۔ آپ ٹی ایس ایلیٹ، دوستوفسکی اور ٹالسٹائی وغیرہ کو مجھ سے بہت بہتر جانتے ہیں۔ ان کے ساتھ بے شمار ماڈرن رائٹر اور بھی ہیں جو اپنے مذہب سے بلا خوف تردید وابستہ ہیں۔ یہ مشکل صرف تھرڈ ورلڈ میں مسلمان ادیبوں کو درپیش ہے کہ وہ اسلام سے اپنی وابستگی کو چھپا کر چلنا چاہتے ہیں تاکہ ان پر جانب داری کا یا رجعت پسندی کا ٹھپہ نہ لگ جائے۔ دنیائے اسلام کا رائٹر سلمان رشدی بننے کو تو تیار ہے لیکن ڈپٹی نذیر احمد یا نسیم حجازی بننے کی جرات نہیں کرتا۔ وہ "بنیاد پرست" نہ کہلوانے کے لئے ہر طرح کی قربانی دینے کو تیار ہے۔ لیکن اب زمانہ کروٹ بدل رہا ہے۔ اب شوگر کوٹڈ گولیاں کسی کام نہیں آئیں گی۔ اب تو یا ادھر یا ادھر اب ماسک پہن کر کسی کو لبھایا نہیں جا سکے گا۔ اگر وابستگی ہوگی اور سچی ہوگی تو ادیب کی شخصیت میں بھی در آئے گی اور اس کی تخلیق میں بھی۔ اب آنیوالے خطرات مسلمان ادیب کو "ڈراکل" نہیں رہنے دیں گے۔ اس کی وابستگی ہر ہر قدم پر اس کا راز افشا کرتی چلی جائے گی اور وہ خوف سے براور ہوتا جائے گا۔ یہ راز اس نے حال ہی میں عیسائیت سے سیکھا ہے جس نے بوسنیا کے معاملے میں یو این او کو مظلوم پر Imbargo امبارگو لگانے کا حکم دیا اور الجزائر میں جمہوریت آجانے پر جمہوریت کے تختہ دانوں نے وہاں جبر کر کے مارشل لا لگوا دیا ------ یہ دور سانپ کے مرنے کا ضرور ہے لیکن اس میں لاٹھی بچانے کی کوئی صورت نہیں۔ اب بے زبان ان پڑھ دنیا اپنا دین ایمان بیچنے والے عالم فاضلوں کی رمزیں بہت خوبی سے سمجھنے لگی ہے۔ اگلا دور منافق علم دوستوں کے مقابلے میں سچے بنیاد پرستوں کا ہوگا۔ لیکن اس میں پھر میرا کوئی قصور نہیں۔

★.... بنی نوع انسان کی فلاح کے لئے سائنس کے مقابلے میں ادب کا مقام یا مستقبل کیا ہے؟

☆.... سائنس انسان کی بڑی محسن ہے۔ اسی نے انسان کو تھکنے سے بچایا ہے اور ہر طرح سے اس کے جسم کی حفاظت کی ہے۔ پھر اس نے انسان

کو جسمانی کلفتوں اور مشقتوں سے نکال کر اسے فرصت' فراغت اور آسودگی عطا کی ہے۔ اب آگے یہ سوچنا انسان کا کام ہے کہ وہ یہ فرصت فراغت اور آسودگی کس طرح سے استعمال میں لائے۔ عیاشی' آوارہ گردی' پریشاں نظری اور نکمے مشاغل اختیار کر کے یا ادب اور مذہب کو اختیار کر کے۔ (ویسے ادب مذہب ہی کی ایک شاخ ہے جس طرح مصوری' بت تراشی' رقص' فن تعمیر' خطاطی' موسیقی' حسن اور جمال کے دوسرے مظاہر مذہب ہی کی بدولت وجود میں آئے۔) جب انسان کو یہ سمجھ آگئی کہ سائنس کی لونڈی ہمارے کام کاج سنوار کر صرف ہمارے جسم کی افزائش اور آسودگی کے لئے بنی ہے تو پھر وہ ضرور ادب کی طرف بھرپور توجہ دے گا۔ ایک ادب ہی کیا دوسرے سارے فنون لطیفہ کی طرف توجہ دے گا' لیکن فی الحال تو وہ اپنی بدنی آسائش سے ایسا مسرور ہوا ہے کہ اسے روح کی بالیدگی کی پرواہ ہی نہیں رہی۔

افتخار عارف' مشتاق یوسفی' اشفاق احمد' مرحوم مقبول عامر اور نامعلوم دوست

گزشتہ دو ایک سال سے اشفاق احمد نے بڑی دھوم مچا رکھی ہے۔ وہ جگہ جگہ مجمع لگائے کھڑا ہے۔ ریڈیو پر ٹی وی پر محفلوں میں سماجی گٹ تو گیدر میں عوام اس کے پروگرام کا انتظار کرتے ہیں۔ دانشور اس کے ڈراموں پر بحث کرتے ہیں۔

بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ یہ رنگین اور منفرد باتوں کے جال بن کر مجمع لگانے والا درحقیقت گونگا ہے۔ اس کی شخصیت دکھ اور چپ کے تانے بانے سے بنی ہے اس کی بزم آرائی اور زعفران زاری شخصیت کے ان بنیادی عناصر سے فرار کی سعی ہے۔

اگر آپ اس کی شخصیت کے بنیادی عناصر سے واقف ہونا چاہتے ہیں تو اسے اس وقت دیکھئے جب وہ اکیلے میں بیٹھا ہو جب اسے یہ احساس نہ ہو کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ یا اسے دیکھے جانے کا امکان موجود ہے اگر اسے ذرا بھی شک پڑ گیا تو اس کے اندر کی نمائش بھری خاتون ہوشیار ہو جائے گی۔

اکیلے میں اشفاق احمد کے چہرے کے خطوط نیچے کی طرف ڈھلک جاتے ہیں۔ پیشانی کی سلوٹیں رینگ کر باہر نکل آتی۔ آنکھیں اندھے کنویں بن کر ڈوب جاتی ہیں۔ چہرے پر اکتاہٹ ڈھیر ہو جاتی ہے۔

اشفاق احمد کھاتے پیتے پٹھان گھرانے میں پیدا ہوا بہت سے بھائیوں میں ایک کے سوا سب سے چھوٹا۔ باپ ایک قابل محنتی اور جابر پٹھان تھا۔ جس کی مرضی کے خلاف گھر میں پتا بھی نہیں ہل سکتا۔ گھر کا ماحول روایتی تھا۔ بندشیں ہی بندشیں۔ اس کے باوجود اشفاق کی شخصیت میں بنیادی طور پر پٹھانیت کا عنصر مفقود ہے۔

اشفاق احمد کی شخصیت میں دکھ اور چپ کا عنصر میرے لئے ایک معمہ ہے چونکہ میں نے زندگی میں آج تک اشفاق احمد سا کامیاب آدمی کبھی نہیں دیکھا۔

اس نے جوانی میں روایت توڑ محبت کی۔ اسے اچھی طرح علم تھا۔ گھر والے کسی غیر پٹھان لڑکی کو بہو بنانے کے لئے تیار نہ ہوں گے اسے یہ بھی علم تھا کہ گھر میں اپنی محبت کا اعلان کرنے کی اس میں کبھی جرات پیدا نہ ہوگی۔ اس کے باوجود ایسے حالات پیدا ہوئے کہ وہ محبت میں کامیاب ہو گیا۔

شادی کے بعد مجبوراً اسے گھر چھوڑنا پڑا۔ اس وقت وہ بے سہارا تھا۔ بے وسیلا گھر کا چولہا جلانے کے لئے مجبوراً اسے سکرپٹ رائٹر بننا پڑا۔ اس زمانے میں سکرپٹ رائیٹنگ کی اس قدر مانگ نہ تھی کہ گزارہ ہو سکے اشفاق احمد کو اس کاروبار میں صرف کامیابی حاصل نہیں ہوئی بلکہ شہرت بھی ملی بے شک اشفاق نے جدوجہد کی محنت کی۔ لیکن محنت کامیابی کی ضامن نہیں ہوتی۔

تقسیم کے بعد جب میں اسے پہلی مرتبہ ملا تو وہ بنیادی طور پر وہی کچھ تھا جو آج ہے۔ دکھ اور چپ کے تار و پود سے بنا ہوا ٹاٹ جس پر یہاں وہاں سنہرے تاگے سے کاڑھی ہوئی پھل پتیاں تھیں۔ آج بھی وہ وہی ٹاٹ ہے۔ البتہ ٹاٹ پن کچھ اور بڑھ گیا ہے۔ سنہری پھل پتیوں کی چمک زیادہ نمایاں ہو گئی ہے۔ ٹاٹ اور سنہرے پن کا تضاد بہت واضح ہو گیا ہے۔

ان دنوں میں بمبئی سے آیا ہوا مہاجر تھا اپنے عزیزوں کو مشرقی پنجاب سے بچا کر لا چکا تھا کوئی ذریعہ معاش نہ تھا۔ مہاجر کیمپ میں مقرر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔

ایک روز کیمپ کے ایک ویران کونے میں جب میں حالات کی وجہ سے پریشان کھڑا تھا تو ایک جٹی سفید شگفتگی اور تازگی سے بھرپور فیار میرے روبرو آ کھڑی ہوئی آنکھیں چمکا کر بولی آپ ممتاز مفتی ہیں۔

جی۔ میں نے جواب دیا۔

ہم نے آپ کی تیاپا پڑھی ہے۔

بہت اچھا کیا آپ نے۔

بولی میں ساتھ والے کیمپ میں ملازم ہوں کبھی ادھر آئیے گا۔

جی اچھا۔ میں نے جواب دیا۔

بولی میرا نام اشفاق احمد ہے۔

پہلی مرتبہ اسے دیکھ کر ایسے لگا جیسے گلابی مخمل پر سنہرے پھول کڑھے ہوں پھر اشفاق اور میں روز ملنے لگے۔

جوں جوں میں اس کے قریب آتا گیا مخمل ٹاٹ میں بدلتی گئی سنہرے چھل بولے ابھرے آتے۔ طوائف کی پشواج کبھی کبھی کھلنے لگتی اس لئے نہیں کہ اشفاق کے اندر کی طوائف بہت نمایاں تھی بلکہ اس لئے کہ وہ میرے اندر کی طوائف سے زیادہ بجز کیلی تھی۔

ہر فنکار میں ایک طوائف ہوتی ہے۔ کسی میں ننگی کسی میں ادھ کھلی کسی میں مستور مثلاً ابو الاثر میں بالکل ننگی تھی۔ محمد طفیل میں مستور ہے۔ انتظار میں ادھ کھلی ہے۔ اشفاق میں گھونگھٹ نکال کر سامنے بیٹھی رہتی ہے۔ اس زمانے میں ہم لارنس باغ میں اوپن ائیر تھیٹر میں ملا کرتے تھے۔ اوپن ائیر تھیٹر ذوبی کے قبضے میں تھا۔ ذوبی اشفاق کا دوست تھا اور جانا پہچانا آرٹسٹ تھا۔ ذوبی خوش باش نوجوان تھا۔ اندر میں سنجیدگی تھی۔ بات میں پھلجھڑی تھی۔

اوپن ائیر تھیٹر میں پہنچتے ہی اشفاق کے اندر کا ڈرامائی نقالیہ باہر نکل آتا پھر رنگین باتوں کے سنہرے جال ہوا میں اڑتے۔ نقلیں تمسخر قصے کہانیاں چٹکلے لطیفے۔ اشفاق احمد تماشا ہوتا ہم تماشائی ہوتے اور اوپن ائیر تھیٹر واقعی تھیٹر بن جاتا۔

اشفاق احمد ٹیلنٹڈ فنکار ہے۔ اس کی ٹیلنٹ کا مرکز آنکھ اور کان ہیں۔ خصوصاً کان۔ وہ مجھ سے زیادہ دیکھتا ہے زیادہ سنتا ہے اس کا ذہن ہر تفصیل کو ریکارڈ کر لیتا ہے اور اس کا نطق اسے من و عن ری پروڈیوس کر سکتا ہے۔

ان دنوں اشفاق احمد ایک لق و دق جزیرے میں رہتا تھا۔ جو رابنسن کروزو کے جزیرے سے کہیں زیادہ ویران تھا۔ اشفاق احمد کا یہ جزیرہ ایک بہت کھلی نیم چھتی تھی جو ایک وسیع و عریض رستے بستے مکان کی اوپر کی منزل پر واقعہ تھی۔

جب بڑے خان گھر پر نہ ہوتے تو نچلی منزل میں ایک میلا لگ جاتا شور شرابا ہنسی مذاق لیکن نیم چھتی میں ہر وقت ہو کا عالم رہتا۔ وہاں چاروں طرف کتابوں کے ریک بھرے ہوئے تھے۔ جن میں رنگا رنگ کی کتابیں تھیں ان کے درمیان فرش پر اشفاق احمد یا تو مطالعہ میں مصروف ہوتا اور یا مستقبل کے منصوبے بناتا جاگتے کے خواب دیکھتا۔

اس جزیرے کو دیکھ کر میں نے جانا کہ اشفاق احمد صرف دکھ اور چپ ہی نہیں ازلی اکیلا بھی ہے۔ وہ بذات خود ایک جزیرہ ہے جو کسی کو کنارے لگنے نہیں دیتا۔ جو نہیں چاہتا کہ کوئی اس کی تنہائی میں مخل ہو۔

سارا سارا دن وہ کتابوں کے انبار میں بیٹھا رہتا۔ بے نام دکھ کا مارا ہوا۔ بے وجہ چپ تلے دبا ہوا۔ پھر آہستہ آہستہ ساری نیم چھتی ایک عظیم اکتاہٹ سے لبالب بھر جاتی۔ اس میں ایک وحشت بیدار ہوتی۔ لپک کر وہ سنہرے چھل بوٹوں والا چغہ پہن لیتا۔ چغہ پہنتے ہی چہرے کے زاویے اوپر کو ابھر آتے۔ ہونٹوں پر روغنی تبسم کھلنے لگتا اور وہ چٹکیاں بجاتا ہوا نیم چھتی کی سیڑھیاں اترنے لگتا۔ پھر یہ خوش باش نوجوان اوپن ائیر تھیٹر میں جا پہنچتا۔ وہاں ڈگڈگی بجاتا۔ گھنگھرو چھنکاتا مجمع لگاتا۔ تھیلے سے رنگین باتوں کے جال نکالتا۔ گنگناتا۔ گاتا۔ ڈرامے کھیلتا قہقہے لگاتا۔ خود ناچتا دوسروں کو نچاتا۔ لیکن یہ دور زیادہ دیر کے لئے نہیں چلتا تھا۔ اس کے بعد پھر وہی جزیرہ وہی ہو حق = وہی دکھ وہی چپ وہی تنہائی۔ وہی اشفاق احمد اس زمانے میں اشفاق کی زندگی اس خاتون کی طرح گزر رہی تھی۔ جو سارا دن ننگے سر ننگے پاؤں ان دھلے منہ اور لٹ پٹ بال لئے دھوپ میں بیٹھی ہونسیاں پانے میں لگی رہتی ہو اور شام کو ہار سنگار کر کے پشواج پہن کے طوائف بن جاتی ہو۔

پتہ نہیں فنکار کی تخلیق میں قدرت اس قدر اہتمام کیوں کرتی ہے۔ اپاہج بنا کر ناچنے کی انگیخت دیتی ہے۔ گونگا بنا کر باتوں کی پھلجھڑیاں چلانے پر اکساتی ہے۔ پتہ نہیں قدرت ایسا کیوں کرتی ہے مگر یقیناً وہ ایسا کرتی ہے۔

اس زمانے میں ایک ویران نیم چھتی میں تنہائی دکھ اور چپ کے بنیادی رنگوں سے قدرت ایک فن کار کی تخلیق کر رہی تھی۔

پتہ نہیں کن وجوہات کی بناء پر اشفاق احمد کی شخصیت میں ہفت رنگی عناصر پیدا ہو چکے ہیں۔ ایک بے نیاز صوفی بابا۔ رکھ رکھاؤ سے سرشار ایک دنیا دار۔ خود نمائی سے بھرپور ایک خاتون پتھر کا بنا ہوا ایک دیوتا۔

دوسروں کو سیمتیں کرنے پر پھبتیاں کسنے والا ایک تلقین شاہ۔ اپنی منوانے والا گھر کا مالک سن کر جذب کر لینے والا ایک عظیم کان۔ مشینوں سے کھیلنے والا ایک بچہ جان دینے والا ایک نیا نیا لنڈھا دینے والا مہمان نواز۔

اشفاق کے والد ایک عظیم شخصیت تھے۔ اتنی عظیم کہ انہوں نے گھر کے تمام افراد کو کبڑا بنا رکھا تھا۔ ان کی وجہ سے گھر میں باشیوں کے بھیڑ لگی ہوتی تھی۔ جب یہ کلیور گھر ہوتا تو کسی کو دم مارنے کی اجازت نہ ہوتی گھر سے باہر ہوتا تو دھاچوکڑی مچ جاتی۔ ان کی بیگم اس سوچ میں کھوئی رہتی کہ عجز ادب احترام اور دنیا داری کا کونسا نیا مرکب ایجاد کیا جائے جس کے زور پر ظل الٰہی کو ڈھب پر لایا جا سکے۔

خان منزل میں صرف پٹھان خصوصیات کی قدر و منزلت تھی۔ چونکہ اشفاق ان خصوصیات سے محروم تھا۔ اس لئے گھر میں وہ سب سے چھوٹا باشیا تھا۔

اشفاق میں انفرادیت کی ایک کلی لگی ہوئی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کوئی انوکھی بات کرے۔ انوکھا کام کرے انوکھی خبر سنا کر دنیا کو حیران کر دے۔ خان منزل میں اس کا یہ جذبہ تشنہ تکمیل رہا۔ دل میں ایک کانٹا سا لگا رہا۔ ردعمل یہ ہوا کہ اب وہ کسی کو کلیور ماننے کے لئے تیار نہیں کسی پہلو سے خود کو باشیا تسلیم کرنے سے منکر ہے۔

اگرچہ وہ اپنی فنکارانہ عظمت کا تذکرہ خود نہیں کرے گا لیکن اس کا جی چاہے گا کہ دوسرا کرے۔ دوسرا کر لے تو اشفاق کے چہرے پر پھلجڑیاں چلنے لگیں گی۔ چہرے کے زاویے اوپر کو ابھر آئیں گے آنکھوں میں تبسم پھوٹے گا۔

کسی دوسرے فنکار کی عظمت کی بات چھڑ جائے تو وہ بات کو کاٹے گا نہیں لیکن ہاں میں ہاں بھی نہیں ملائے گا۔ اشفاق احمد کی شخصیت کے سادھوپن سے مجھے انکار نہیں لیکن اس کی فنکارانہ انا خاموشی کے گھونگھٹ تلے چھپے رہنے کے باوجود بڑی طوطا چشم ہے۔

اس جزیرے کی بوجھل تنہائی میں اشفاق احمد نے جو اظہار کا پہلا طریقہ آزمایا وہ مصوری تھا۔ یہ ذوقی سے میل ملاپ کی وجہ سے تھا۔ لیکن کچھ دیر کے بعد اس نے مصوری چھوڑ کر ادب کو اپنا لیا۔ اور وہ مختصر افسانے لکھنے لگا۔

مصوری کا دور صرف تین چار سال رہا۔ اس کے دو عمل مجھے ابھی تک یاد ہیں۔ پہلے عمل کا نام کال بل تھا۔ تصویر میں نسائی جسم کا وہ برتی بٹن دکھایا گیا تھا۔ جسے دبانے سے محترمہ رکھ رکھاؤ اور لاج کے پردے چاک کر کے باہر نکل آتی ہے۔ تصویر سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے باہر نکل آنے والی محترمہ دراصل ایک جن ہو جسے انسانی بوتل میں قید کر رکھا ہو۔

دوسرے عمل کا کوئی نام نہ تھا۔ ہوتا تو "ری فالک وومن" ہوتا۔ تصویر میں ایک عورت دکھائی گئی تھی۔ جس میں جنسی تقاضوں کی گٹھڑیاں کندھوں پر رکھی ہوئی تھیں۔ اور وہ آرزوؤں کی ان مٹکیوں کو سرِ عام، چھلکاتی پھرتی تھی۔

پتہ نہیں اشفاق احمد نے عمل نگاری میں جنس کا موضوع کیوں اپنایا۔ چونکہ اشفاق احمد کا جنس سے اکاؤ حسنی ہے۔

جنس کے لحاظ سے مرد کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جو جذبے کا دریچہ کھولے بغیر جنس کے ایوان میں چہل قدمی کے شوقین ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ کہ جب تک جذبات کا دروازہ نہ کھلے جنس کے خد و خال نہیں ابھرتے۔ اور تیسرے وہ کہ جذبات کی کھڑکی کھل بھی جائے۔ تو بھی جنس سے خائف رہتے ہیں۔ اشفاق احمد تیسری قسم سے تعلق رکھتا ہے۔ ان دنوں اشفاق احمد کی آرزو تھی کہ شوخ اور طرحدار لڑکیوں کو باتوں کے جال بن کر اپنی طرف متوجہ کرے۔ متاثر کرے۔ جب وہ تاثر سے بھیگ جاتیں۔ تو اشفاق پر گھبراہٹ طاری ہو جاتی "اب کیا ہوگا۔" اشفاق اب بھی عورت کے قرب سے ڈرتا ہے۔ قریب مت آؤ دور کھڑی ہو کر بات کرو۔

لیکن نسائی نفسیت کے مطابق فاصلے نہیں بلکہ قرب محفوظ ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ آگے بڑھنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس اشفاق کے لئے فاصلہ محفوظ تھا۔ اس لئے وہ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوتا۔ زندگی میں وہ بار بار پیچھے ہٹا۔ الٹے پاؤں بھاگا۔ ہونکتا ہوا اپنی نیم چھتی میں پہنچا۔ سچے دل سے باتوں کے جال بننے سے توبہ کی لیکن باتوں کے جال بننے پر مجبور تھا۔ بار بار توبہ ٹوٹی۔ حتیٰ کہ گورنمنٹ کالج میں وہ محترمہ منظر خاص پر آ گئی۔

وہ محترمہ بڑی چتر کار تھی۔ اندر سے قدیم اوپر سے جدید۔ اوپر سے ساد مرادی اندر بن ٹھن ہی بن ٹھن۔ اوپر سے ٹھہراؤ ہی ٹھہراؤ اندر جذبات کی اتھل پتھل۔ اوپر ذہن ہی ذہن اندر دل ہی دل۔ وہ محترمہ دروپدی اور گیشا کا سنگم تھی۔ وہ محترمہ متاثر ہو کر آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے ہٹنے کی عظمت کو جانتی تھی۔ وہ محترمہ ان مشرقی خواتین میں سے تھی۔ جو پیچھے ہٹنے والوں کو پہچانتی ہیں۔ اور خود پیچھے ہٹ کر انہیں پیچھے ہٹنے کی ندامت سے بچا لیتی ہیں۔

بڑے واقعات ہمیشہ چھوٹی سی بات سے جنم لیتے ہیں۔

ایک روز محترمہ کالج کے برآمدے سے گزر رہی تھی۔ اشفاق نے سوچا کوئی منفرد بات کروں۔ اس نے ہاتھ پھیلا دیا۔ ایک آنہ دے دیجئے کس لئے محترمہ نے پوچھا۔ سگریٹ پیوں گا۔

محترمہ نے اکنی ہتھیلی پر رکھ دی۔ فتنہ و فساد کے ایوان کی بنیاد میں پہلی اینٹ رکھ دی گئی۔

پھر بات بڑھتی گئی۔ اشفاق احمد سارا دن موقعہ ڈھونڈتا کہ ہاتھ پھیلا کر کے ایک آنہ۔ محترمہ منتظر رہنے لگی۔ پھر اہتمام کرنے لگی کہ جیب میں ٹوٹی ہوئی اکنی موجود رہے۔ بات بڑھی تو محترمہ آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے ہٹنے لگی۔ اشفاق حیران رہ گیا۔ وہ "اب کیا ہوگا۔" کے فکر سے آزاد ہو گیا۔ اس لئے آگے بڑھنے لگا اور آگے اور آگے۔ یہ اس کے لئے ایک انوکھا تجربہ تھا جس میں آگے بڑھنے کی لذت تو موجود تھی لیکن فاصلہ کم ہونے کا خدشہ نہ تھا۔ آگے بڑھتے بڑھتے وہ اس مقام پر پہنچ گیا۔ جہاں سے واپسی ممکن نہیں رہتی۔

اشفاق طبعاً۔ ایک گیلی لکڑی ہے۔ بھڑک کر جلنے کی صلاحیت سے محروم صرف سلگتا جاتا ہے۔ سال ہا سال سلگتا رہا۔ محترمہ میں انتظار کرنے کا حوصلہ تھا۔ حالات ناسازگار تھے۔ خاندان روایتی تھا۔ باپ جابر تھا۔ اشفاق گونگا تھا۔ آخری قدم اٹھانے کی ہمت نہ تھی۔ ایک بھائی اور دو دوستوں نے زبردستی اٹھا کر ملا کے سامنے بٹھا دیا محترمہ کی والدہ تعلیم یافتہ تھی۔ سمجھدار تھی۔ وسعت دل کی حامل تھی۔ اس نے تعاون کیا۔ شادی ہو گئی۔ گھر والوں نے اسے بھگوڑا قرار دے دیا اور لا تعلق ہو گئے پلے کچھ تھا نہیں کہ گھر کا چولہا جلتا رہتا۔ دونوں میاں بیوی نے کانوں پر قلم ٹانگے۔ اور "سکرپٹ لکھوا لو چلو جی کوئی سکرپٹ لکھوا لو" کا ہوکا دیتے ہوئے گھر سے باہر نکل گئے۔ یہ محترمہ بانو قدسیہ تھی۔ اشفاق احمد نے برش اور رنگ کو کیوں تیاگ دیا۔ اس کی جگہ قلم کو کیوں اپنا لیا۔ غالباً اس لئے کہ عمل میں وہ اتنی تفصیلات نہیں دکھا سکتا تھا۔ جو داستان گو کے بورے میں بھری ہوئی تھیں اصولی طور پر تو اسے مغنی ہونا چاہئے تھا۔ چونکہ وہ ایک عظیم کان کا مالک ہے۔ لیکن اشفاق کو انسانی کردار سے دلچسپی تھی۔ خالی آواز کا زیر و بم اسے جذب نہ کر سکا۔ اس لئے اشفاق احمد افسانہ نویس بن گیا۔

ادب میں شہرت پانے کے بعد دنیائے ادب میں رکنا اس کے لئے مشکل ہو گیا۔ اس کے اندر کی طوائف کا دم گھٹنے لگا۔ اور وہ شو مین بزنس میں جا شامل ہوا۔ اولیں دور میں اشفاق احمد کو کچھ کرنے کا شوق تھا۔ اب اسے کچھ کر دکھانے کا شوق ہے۔

اشفاق احمد ایک پرفیکشنسٹ ہے۔ وہ جو کام بھی کرتا ہے۔ اس کے اندر دھنس جاتا ہے۔ اس قدر اندر دھنس جاتا ہے کہ لت پت ہوئے بغیر باہر نہیں نکلتا۔ مثلاً جب وہ ماڈل ٹاؤن میں مکان بنا رہا تھا تو کئی ایک ماہ کے لئے معمار بن گیا۔ چنائی اور پلستر کے کاموں کے اندر دھنس گیا۔ جب وہ مکان میں نلکے لگوا رہا تھا۔ تو آٹھ روز برانڈرتھ روڈ کے چکر لگاتا رہا۔ اس نے تمام ٹونٹیاں دیکھیں۔ کس کس کا منہ کھلا ہے کس کس کا بند بند سا ہے پیچ میں کتنے کتنے چکر ہیں۔ کس کس کا واشل مضبوط ہے۔ کھولیں تو کتنی دھار نکلتی ہے۔ بند کریں چونے کی صلاحیت کس قدر ہے۔ آٹھ دن کی تحقیق کے بعد وہ ٹونٹیوں پر تفصیلی مقالہ لکھ سکتا تھا۔ کہ پاکستانی کارخانوں کی بنی ہوئی ٹونٹیوں کے کیا کیا خواص ہیں۔ کیا کیا خوبیاں ہیں کیا کیا خامیاں ہیں۔ یہ تفصیلات اکٹھی کرنے کے بعد اس نے مکان کے نلکوں کے لئے ٹونٹیاں خریدیں۔

کباب بنانے کا شوق پیدا ہوا تو لاہور کے معروف کبابیوں سے کوائف اکٹھے کرتا رہا۔ قیمہ کیسا ہونا چاہئے۔ مصالحہ کیسا ہونا چاہئے۔ آنچ کیسی ہو کتنی ہو۔ اس کے بعد اس نے کباب بنانے کی سیخیں خرید لیں۔ اور میاں بیوی مل کر کباب سازی کی مشق کرتے رہے۔ اب اشفاق کے ہاتھ کے بنے ہوئے کباب منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ اکثر دوستوں کو مدعو کرتا ہے۔ خود کباب بنائے جاتا ہے۔ دوست کھائے جاتے ہیں۔

اس شوق تحقیق کو اشفاق کام میں نہیں لا سکتا۔ اس کی تحقیق کا مقصد صرف لذت تحقیق ہے ورنہ آج گلبرگ میں اس کی دکان ہوتی اور سارے لاہور میں اشفاق کبابیے کی دھوم ہوتی۔

اشفاق احمد نے آج تک اپنے ایک فن سے صرف ایک فن سے مالی فائدہ حاصل کیا ہے۔ اور وہ ہے۔ سکرپٹ رائٹنگ۔ عرصہ دراز تک اشفاق کے گھر میں حساب کتاب سکرپٹوں میں ہوتا رہا۔ کرایہ مکان چار سکرپٹ۔ باورچی خانے کا خرچ آٹھ سکرپٹ علاج معالجہ ڈیڑھ سکرپٹ۔ لین دین دو سکرپٹ آج بھی بانو سے پوچھو یہ صوفہ کتنے میں خریدا تھا۔ تو وہ کہے گی اچھی طرح یاد نہیں شاید تین سکرپٹ لگے تھے۔

آج بھی میاں بیوی ہنگامی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے قلم کا پھاوڑا چلاتے ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ دونوں کے سکرپٹوں سے مشقت کے پسینے کی بو نہیں آتی ان کے گھر چلے جاؤ تو یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ منشیوں کا گھر ہے۔ الٹا وہ تو فارغ البال میزبانوں کا گھر لگتا ہے۔ یہ آج کی

بات نہیں ان دنوں بھی ان کا گھر فارغ البالیوں کا گھر لگتا تھا جب چولہا جلائے رکھنے کا مسئلہ پیش پیش تھا۔

اشفاق کی خوش قسمتی کا ایک اور پہلو ملاحظہ ہو۔ اشفاق احمد نے ایک خاتون سے عشق کیا۔ کئی ایک سال وہ اس کے عشق میں گھلتا رہا۔ عشق میں کامیاب ہوا۔ خاتون بیوی بن کر گھر آئی تو وہ محبوبہ نہ تھی بلکہ عاشق نکلی۔ ورنہ اشفاق احمد کے جملہ کس بل نکل جاتے۔ محبوب طبیعت وہ ازلی طور پر تھا۔ بیوی کی آمد کے بعد بالکل ہی دیوتا بن گیا۔ کانٹا اشفاق کو چبھتا ہے۔ تو درد بانو کو ہوتا ہے۔ تھپڑ اشفاق چلاتا ہے تو آبلے بانو کے ہاتھوں میں پڑتے ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ ایک خالص پکی دانشور نے پتی بھگتی میں اپنا سب کچھ جذبات ذہن روح تیاگ رکھا ہے۔ بانو بہت بڑی مفکر ہے وہ ہر بات میں صاحب رائے ہے۔ عقل و خرد سے بھرپور لیکن جب اشفاق طلوع ہو جائے تو سب کچھ سپاٹ ہو جاتا ہے۔ عقل خرد و دانشوری۔

اشفاق کو شریفانہ قسم کا غصہ نہیں آتا غصہ تو آتا ہے۔ لیکن غصے میں وہ بھڑک کر جلنے کی عشرت سے محروم ہے۔ وہ چڑ چڑ کرتا ہے۔ سلگتا ہے۔ بل کھاتا ہے اور اپنی سلگن کا دوسرے کی ناک میں دھواں دیتا رہتا ہے۔ کئی بار اس کی چڑ چڑ اس قدر شدید ہو جاتی ہے کہ گھر بھٹیاری کی کڑاہی بن کر رہ جاتا ہے۔ چڑ چڑ دانے بھنتے رہتے ہیں۔

یہ چڑ چڑ بھی اس کے لئے خوش قسمتی کا باعث بن گئی۔

گمان غالب ہے کہ ایک دن جب بھٹارن دانے بھون رہی تھی۔ اسے وہ شخصیت یاد آگئی جس نے اسے چڑ چڑ کا تحفہ بخشا تھا۔ وہ گلیور جس نے بچپن میں اسے ٹھگنا بنائے رکھا تھا۔ اس وقت اشفاق احمد اپنے نئے سکرپٹ کے لئے موضوع سوچ رہا تھا۔ اس نے بچپن کے گلیور کا قصہ لکھ دیا۔

یوں تلقین شاہ وجود میں آگیا۔

تلقین شاہ ایک جاذب توجہ کردار ہے۔ لوگوں نے تلقین شاہ سنا تو بھونچکے رہ گئے۔ ہر کسی کے دل کی گہرائیوں میں چھپے ہوئے بالشتئے نے سر نکالا۔ اور دوسروں کو تلقین کرنے والے گلیور پر تالیاں بجانے لگا۔ ہم سب میں کہیں نہ کہیں ایک چھپا ہوا بالشتیا موجود ہے۔ جس کا وجود کسی نا کسی تلقین شاہ کا مرہون منت ہے۔

تلقین شاہ کی آمد پر بہت سے بھرے ہوئے پھوڑے پھوٹ بہے دلوں میں تنے ہوئے پیچ و تاب ڈھیلے پڑ گئے۔ دبے ہوئے۔ غصے تمسخر کی شکل میں مجسم ہو گئے۔ انتقام کے جذبات ترس بدل گئے۔ پند و نصیحت کا بھانڈا چوراہے میں پھوٹ گیا۔ تلقین شاہ دلچسپ کردار ہی نہیں وہ بہت اچھا سائیکیٹرسٹ بھی ہے۔ ایک ذہنی ڈاکٹر جس نے بہت سے کبڑوں کو سیدھا کر دیا بالشتیوں کو قد و قامت عطا کیا۔ گونگوں کو زبان بخشی۔ دل میں پڑی ہوئی گرہوں کو کھولا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بتوں کو توڑ دیا لوگوں نے فرط محبت سے اس بت شکن کو آنکھوں پر بٹھا لیا۔ اشفاق احمد ہکا بکا رہ گیا۔ اسے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ شہرت کسے کہتے ہیں۔ کہ عوام آنکھوں پر بٹھا لیں تو آسمان کے تارے قدموں میں آگرتے ہیں۔ مگر شہرت گھر والوں کو راس نہ آئی۔ اشفاق احمد گھر میں بالکل ہی پتھر کا بت بن کر بیٹھ گیا۔ کامیابی بڑی ظالم چیز ہے۔ وہ انسان کو پتھر کا بنا دیتی ہے۔

اس کامیابی پر بھی اشفاق احمد کو شکایت ہے۔ کہتا ہے۔ یارو کیسی اندھیر نگری ہے۔ تلقین شاہ کو تخلیق کرنے والے کو کوئی نہیں پوچھتا تلقین شاہ پر جان چھڑکتے ہیں۔ لکھنے والے اشفاق احمد کو نہیں مانتے اس صداکار کے دیوانے ہیں جو یہ کردار بولتا ہے۔ شکر ہے تلقین شاہ کا پارٹ ادا کرنے والا خود اشفاق احمد ہے ورنہ کوئی اور ہوتا تو اشفاق احمد تلقین شاہ کا گلا گھونٹ دیتا۔ اور یا خود کشی کر لیتا۔

اپنی تخلیق میں اشفاق احمد کسی دوسرے فرد کو کریڈٹ میں حصہ دار بنانے کے لئے تیار نہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ تمام تر کریڈٹ لکھنے والے کا حق ہے۔ آپ اسے کہیں کہ یار تیرے ٹی وی ڈرامے میں فلاں شخص نے اچھا رول کیا۔ یہ بات اسے ناگوار گزرے گی۔ فوراً جواب میں کہے گا۔ ہاں اس نے خاصا کام کیا۔ بڑی ڈھونڈ کے بعد یہ لڑکا تلاش کیا تھا۔ ریہرسل میں آیا تو بالکل کچا نکلا۔ بڑی محنت کرنی پڑی ------ خیر نبھا گیا کریڈٹ دینے میں اشفاق احمد کنز ہیا ہے۔

اشفاق احمد ایک باغ و بہار ساتھی ہے۔ خوش گفتار دوست ہے۔ بظاہر نرم مگر بڑا سخت گیر افسر ہے۔ چڑ چڑ کرنے والا خاوند ہے۔ جو اپنی سلگن سے گھر والوں کی ناک میں دھواں دیتا رہتا ہے۔ بڑا چالاک جی حضوریہ ماتحت ہے۔ کام اپنی مرضی کے مطابق کرتا ہے۔ افسر کو یہ احساس دیتا ہے کہ اس کی مرضی کے مطابق ہو رہا ہے پسینہ بہانے والا کامی ہے۔ منہ زبانی مرد ہے۔ عظیم پراپیگنڈسٹ ہے۔ اثر ڈالنے کا بادشاہ ہے۔ خود پسند ہے۔ ملف سفیشنٹ ہے۔

اشفاق احمد نے بانو کی تخلیقی قوتوں کو سچے دل سے کبھی تسلیم نہیں کیا۔ حالانکہ ادبی میدان میں بانو کی حیثیت اشفاق سے بلند تر ہے۔ اگر آپ

بانو کی تخلیق کاری کے متعلق بات کریں تو کہے گا ہاں اچھا لکھتی ہے لیکن یار بڑی مغز ماری کے بعد اسے یہاں لایا ہوں۔ اب بھی میرے فقرے چراتی رہتی ہے۔

اشفاق احمد کی خود پسندی کی زیادہ تر ذمہ داری بانو پر عاید ہوتی ہے۔ بانو اشفاق سے بے حد محبت کرتی ہے اور اس کی محبت کا شیرا اتنا گاڑھا ہے کہ وہ چپ چپ کرتی رہی ہے۔ اشفاق اس شیرے کی دلدل میں یوں بیٹھ رہتا ہے جیسے بھنس راب کے جوہڑ میں پھنسی ہو۔

اشفاق کو اپنے رنگ میں دیکھنا ہو تو اس وقت دیکھئے جب وہ کھیا بنیان پہنے درخت کی چھاؤں میں کھاٹ پر بیٹھا کچھ کھا پی رہا ہو۔ اشفاق کھانے کا رسیا ہے بشرطیکہ کھانا من بھاتا ہو وہ پسند کی چیز کھاتا ہے۔ اور پھر بسیار خوری کا شکار ہو جاتا ہے۔ جب وہ کھا رہا ہو تو اندر کی طوائف بے اثر ہو کر رہ جاتی ہے۔ کوئی دیکھتا ہے تو پڑا دیکھے۔ وہ اس انہماک سے کھاتا ہے کہ گرد و پیش معدوم ہو جاتے ہیں۔ لذت میں تھترا جاتا ہے یوں جیسے مینڈک کیچڑ میں لت پت ہو رہا ہو۔ اس وقت بانو بھی قابل دید ہوتی ہے۔ وہ خوشی سے لت پت ہو رہی ہوتی ہے۔ ایک طرف ڈالڈا ہی ڈالڈا دوسری طرف ممتا ہی ممتا۔

اشفاق احمد ذات کا مستری ہے۔ اسے مشینوں سے محبت ہے۔ اور گیجٹ اس کی جان ہیں میرے سکوٹر کو دیکھ کر وہ ہمیشہ احتجاجاً بڑبڑ کرتا رہتا ہے۔ ظالمو تم اس ننھی سی جان کا ذرا خیال نہیں رکھتے۔ تمہیں کیا پتہ کہ ایک چھوٹا سا نازک سا انجن اپنی ننھی سی جان کے بل بوتے پر لوہے کے اتنے بڑے کھڑ کھڑے کو دھکیل کر چلاتا رہتا ہے۔ ظالمو اس ننھی سی جان کا کچھ تو خیال کیا کرو اس کے گھر میں مشینوں گیجٹوں اور اوزاروں کی ایک بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ چاہے اس کی جیب میں پھوٹی کوڑی نہ ہو۔ دکان میں نئے گیجٹ کو دیکھ کر بچے کی طرح مچل جائے گا۔ اسے غور سے دیکھے گا۔ اس کے ورکنگ کو سمجھے گا۔ اس سے کھیلتا رہے گا۔ پھر اس کو خریدنے کے لئے تڑپتا رہے گا۔ جب تک خرید نہ لے گا چین سے نہیں بیٹھے گا۔ اشفاق نے اپنے گیراج میں ایک ورک شاپ بنا رکھی ہے۔ جو تمام اوزاروں اور سامان سے لیس ہے نتیجہ یہ ہے کہ اس کے تینوں بیٹے اعلیٰ قسم کے مستری ہیں۔ لکڑی اور لوہے دونوں کاموں میں دسترس رکھتے ہیں۔

فارغ وقت میں اشفاق اپنی مشینوں اور گیجٹوں کو باہر نکالتا ہے پیار سے صاف کرتا ہے۔ تیل دیتا ہے۔ گریس لگاتا ہے۔ کل پرزے چیک کرتا ہے۔ کوئی نقص ہو تو اسے دور کرتا ہے۔ آپ اشفاق سے اس کی موٹر مانگیں۔ کبھی نہ دے گا۔ خود کو ڈرائیور بنا کر پیش کر دے گا۔

آج بھی اتنی شہرت کا مالک ہونے کے باوجود اتنی جان پہچان ہونے کے باوجود میل ملاپ کے باوجود اشفاق احمد اندر سے وہی راہبِ کروزو ہے۔ جو کئی ایک برس پہلے خان حنزل کی نیم چھتی میں مقیم تھا۔ بنیادی طور پر وہ آج بھی لوگوں سے ملنے سے ہچکچاتا ہے۔

اکیلے میں وہ یوں بیٹھا ہوتا ہے جیسے مگرمچھ ساحل کے کنارے دھوپ میں کیچڑ میں لت پت پڑا ہوتا ہے۔ اس وقت اگر کوئی اطلاع دے کہ فلاں صاحب ملنے آئے ہیں تو اس کے ماتھے پر تیوری ابھرتی ہے۔ تلوار سی دھار والی تیوری۔ ڈرائینگ روم کی طرف جاتے ہوئے اس کے چہرے پر جلی حروف میں لکھا ہوتا ہے۔ مارے گئے۔

یہ اور بات ہے کہ ملاقاتی کمرے میں پہنچ کر اس کے اندر کی طوائف جاگ اٹھے اور وہ باتوں کے سنہرے جال بننا شروع کر دے شاید آپ میری بات نہیں مانیں گے اگر میں کہوں کہ لاہور میں اتنے سال رہنے کے باوجود وہ کوئی دوست نہیں بنا سکا۔ کوئی ایک آدمی بھی ایسا نہیں جس کا اشفاق انتظار کھینچے۔ جسے کوئی بات بتانے کے لئے بے قرار ہو۔ اس میں دوست بنانے کی صلاحیت سرے سے مفقود ہے ------ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک سلف سفیشنٹ آدمی ہے اشفاق احمد اینٹی سوشل نہیں صرف اَن سوشل ہے۔ اس نے کئی بار شدت سے محسوس کیا ہے کہ اسے سوشل بننا چاہئے۔ کئی بار میاں بیوی نے بیٹھ کر سوشل بننے کا پروگرام بنایا۔ کہ شام کو سوشل وزٹ کیا کریں گے آج ان کے ہاں کل ان کے ہاں۔ انہوں نے قابل وزٹ لوگوں کی ایک لسٹ بنائی درجہ وار لسٹ۔ بازار سے ایک جامع کتاب خریدی جس میں سوشل گفتگو کی تفصیلات درج تھیں سوشل آداب درج تھے۔ ایک مہینے کی تیاری کے بعد جب عمل کا موقعہ آیا تو ایک ہفتہ وزٹ کرتے رہے۔ آٹھویں دن دونوں بیٹھے آہیں بھر رہے تھے۔ مشکل کام ہے۔ اشفاق نے کہا۔ بات نہیں بنتی بانو نے جواب دیا۔ الٹا گھر رہی ہے۔ اشفاق نے کہا اور سوشل پروگرام ختم ہو گیا۔ اشفاق احمد کے گھر کا مرکز ڈرائینگ روم نہیں بلکہ باورچی خانہ ہے۔ باورچی خانے کے ایک جانب میز لگا ہوا ہے۔ یہ باورچی خانہ ہی ڈرائینگ روم ہے' یہی ڈرائینگ روم ہے' یہی سٹنگ روم ہے۔

اشفاق کے گھر کا باورچی خانہ سارا دن آدھی رات تک یوں چلتا رہتا ہے جیسے رہٹ والا کنواں۔ اس رہٹ پر بانو بندھی رہتی ہے۔ یہ بانو کا کمال ہے کہ بندھی ہونے کے باوجود بندھی نہیں دکھتی۔ وہ باورچی خانے

یہ انداز دوستاں

میں یوں استادہ نظر آتی ہے جیسے جھیل میں کنول کا پھول اگا ہو۔ دونو ہی مہمانداری کے جذبے سے یوں بھرے ہوئے ہیں جیسے گلا ہوا مالٹا رس سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ اشفاق پٹھان ہے۔ بانو جاٹ ہے۔ دونوں ہی کھلانے کے متوالے ہیں۔ سونے پر سہاگا نور بابا نے چھڑکا۔

نور بابا صوفی منش درویش تھا۔ اس کا ڈیرا لاہور چھاؤنی کی ایک سڑک پر واقع تھا۔ نور بابا کا مسلک لوگوں کو کھانا کھلانا تھا۔ پتہ نہیں اشفاق ڈیرے پر کیسے جا پہنچا۔ بابا کو اشفاق کی باتیں بہت پسند آئیں۔ بابا اشفاق سے محبت کرنے لگا۔ لہٰذا اشفاق کا ڈیرے پر جانا لازم ہو گیا۔

نور بابا کہتا تھا۔ پتر لوگوں کو کھلاؤ جو کچھ تم خود کھاتے ہو پہلے اسے حلال کر لو۔ خود کھانے سے پہلے دوسروں کو کھلاؤ۔ دوسروں کو کھلاؤ گے تو وہ حلال ہو جائے گا۔ سودا خریدو تو اسے پہلے حلال کر لو۔ کسی کے لئے آٹا خریدو چاول خریدو۔ خود کپڑا پہننا ہے تو پہلے دوسرے کے لئے کپڑا خریدو۔

اشفاق کو بات دل لگی۔ اس نے بانو کو بتائی دونوں نے فیصلہ کر لیا کہ کھلاؤ۔ کھلاؤ۔ کھلاؤ۔ یوں ان کا باورچی خانہ چلنے لگا یوں چلنے لگا جیسے رہٹ چلتا ہے۔ یہ رہٹ آج بھی چل رہا ہے۔ بانو اس رہٹ سے بندھی ہے اسے چلا چلا کر اس کی نسیں تار تار ہو چکی ہیں پٹھے سخت ہو گئے ہیں جسم میں جان نہیں رہی۔ لیکن رہٹ چل رہا ہے۔

اشفاق احمد کے گھر سے مجھے محبت ہے۔ میرے لئے وہ یوں ہے جیسے طوفان زدہ پانیوں میں سرسبز جزیرہ ہو وہ میرے لئے پناہ گاہ ہے۔ عشرت کدہ ہے۔ وہ پاکیزہ جگہ جہاں ذکر حبیب رہتا ہے۔

مجھے اس گونگے اکیلے رابنسن کروزو سے شدید لگاؤ ہے۔ جو فرش پر اپنی انا میں لت پت پڑا رہتا ہے۔

مجھے اس فرائی ڈے سے بے پناہ محبت ہے جو ممتا کے گاڑھے شیرے کی کڑاہی لبالب بھرے خدمت کے جذبے سے سرشار چی بھتی کا دیا جلائے بیٹھی ہے۔

مجھے ان تین جنوں سے پیار ہے۔ جو دو بڑے تخلیق کاروں کے سائے تلے رہ کر بھی کبڑے نہیں ہوئے۔

اشفاق احمد' اردو افسانہ نگاروں کی صف اول سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر اب وہ ایک طرح سے افسانہ لکھنا ترک نہیں کر چکے تو کم اہم ضرور جان چکے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنی دانست میں اپنی تخلیقی شخصیت کے اظہار کے لئے نیا میڈیم اور نئی فارم دریافت کر چکے ہیں' جس کی بدولت وہ چند سو ادبی قارئین کے عوض لاکھوں سامعین اور ناظرین کی توجہ کے ساتھ ساتھ مالی استحکام بھی پا چکے ہیں۔ ریڈیو سے "تلقین شاہ" گذشتہ انیس برسوں سے پیش ہو رہا ہے۔ وہ لکھتے اور پیش کرتے ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ مرکزی کردار بھی ادا کرتے ہیں۔ ٹیلی ویژن سے "ایک محبت سو افسانے"۔ "اور ڈرامے" اور "توتا کہانی" نامی تین ڈرامائی سیریز پیش کر چکے ہیں۔ اور آخری دو سیریز کی وجہ سے ان کا نام متنازعہ فیہ بن چکا ہے۔ چنانچہ اشفاق احمد پر "ابن الوقت" کی پھبتی کسی جاتی ہے۔ لیکن اس کے شدید ترین مخالف بھی اس کے شاہکار افسانے گڈریا کی عظمت کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس لئے حیرت ہوتی ہے۔ جب گڈریا' کے مرکزی کردار' داؤ جی' پر نذیر احمد جیسے اردو افسانے کے اہم ترین ناقد کے یہ اعتراضات دیکھتے ہیں۔

☆ "افسانہ نگار نے جو عمارت کھڑی کی ہے۔ اس نے داؤ جی کے کردار کو بحیثیت مجموعی بہت عجیب و غریب اور بے ڈھنگا بنا دیا ہے' وہ مذہباً ہندو ہے' لیکن آیات قرآنی کا ورد کرتا ہے۔ فارسی کا رسیا ہے اس کا ظاہر ہندوانہ' باطن مومنانہ۔ داؤ جی پر یہ سارا بوجھ اس لئے لادا گیا ہے کہ اسے انسان دوستی کی علامت بنایا جا سکے"۔ (اشفاق احمد کی افسانہ نگاری۔ نقوش نومبر دسمبر 1969ء۔ ص 402)

☆ "آفتاب (جلا وطن۔ قرۃ العین حیدر) بڑا قد آور کردار ہے اور اس کی ناکامی میں المیہ کی شان ہے اس کے سامنے اشفاق کا داؤ جی بونا اور بے ڈھنگا ہے۔ اس (داؤ جی) کے انجام میں ملکو ڈرامائی عنصر ہے۔" (ایضاً۔ ص 403)

☆ اگر ہم ان اعتراضات کے جواب کے لئے داؤ جی سے ہی رجوع کریں' تو اس کے کلام کا اخلاص اس تضاد کو حل کر دیتا ہے جو اس کی ہندووانہ چوٹی اور مومنانہ کردار میں دکھائی دیتا ہے۔

☆ "میں ذات کا گڈریا' میرا باپ منڈای کا گوالا' میں جہالت کا فرزند' میرا خاندان ابوجہل کا خانوادہ' اور آقا کی ایک نظر کرم' حضرت کا ایک اشارہ' حضور نے پنتو کو منشی چنت رام بنا دیا' لوگ کہتے ہیں۔ منشی جی۔ میں کہتا ہوں رحمتہ اللہ علیہ کا کفش بردار" (اجلے پھول' ص 182)

☆ "شکر کردگار کنم کہ گرفتارم بہ مصیبتے نہ کہ بہ معیتے...... میں تو اس کے کتوں کا بھی کتا ہوں۔ جس کے سر مطہر پر کے کی ایک کم نصیب بڑھیا غلاظت پھینکا کرتی تھی۔" ص 194)

☆ (سر پر بوری) میری مرحوم ماں کی نشانی ہے اور مجھے زندگی کی طرح عزیز ہے۔" (ص 209)

☆ "میں اس بات سے انکار نہیں کرتا کہ داؤ جی کے کردار کی تشکیل میں آئیڈیلزم کا بڑا حصہ ہے' مگر نہ صرف ایک ہزار برس کی ثقافتی روایت بلکہ بھگتی اور تصوف کے انسان دوست رویوں کے تناظر میں داؤ جی کو

دیکھیں' تو اس ہندو کردار کا اپنی بیٹی (قرۃ العین۔ داؤ جی کی بیوی کہتی ہے۔ "تو نے اس کا نام قرۃ رکھ کر اس کے بھاگ میں کرتے بیٹے لکھوا دیئے ہیں۔ ص 174) کے بیاہ کے لئے استخارہ کرنا۔ ڈولی میں روتی ہوئی بیٹی سے کہنا۔ "لاحول پڑھو بیٹی۔ لاحول پڑھو" (ص 207) حکیم ناصر علی سیستانی سے علم ہندسہ پڑھنا' سکندر نامہ زبانی یاد کرنا' اپنے معذور مسلمان محسن اور معلم کو کندھوں پر' اٹھائے اٹھائے پھرنا اور حال کھیلنا خلاف قیاس نہیں۔ رہ گئی بات قرۃ العین حیدر کے ڈاکٹر آفتاب رائے کی' بلاشبہ وہ ایک دلکش کردار ہے' مگر دو باتیں یہاں بھی پیش نظر رکھنی چاہئیں۔ ایک تو یہ کہ قرۃ العین حیدر کے کردار بالعموم مہاتما بدھ کی طرح خاموش رہتے ہیں۔ اور ان کی چپ ماحول کو گمبھیر ہی نہیں' سوگوار بھی بناتی ہے' جب کہ اشفاق احمد کے تھا' اداس اور دل گرفتہ کردار بولتے ہیں۔ اور ان کے طویل مکالمے بھی دل پر وار کرتے ہیں۔ گڈریا کا اختتامی حصہ بے حد موثر ہے۔ مگر یہاں بھی داؤ جی کا ایک استفسار قیامت ڈھاتا ہے:

"کلمہ پڑھ پنڈتا اور داؤ جی آہستہ سے بولے' کونسا؟ رانو نے ان کے ننگے سر پر ایسا تھپڑ مارا کہ وہ گرتے گرتے بچے اور بولا۔" سالے کلمے بھی کوئی پانچ سات ہیں" ——— جب وہ کلمہ پڑھ چکے تو رانو نے اپنی لاٹھی ان کے ہاتھ میں تھما کر کہا۔ "چل بکریاں تیری انتظاری کرتی ہیں۔" اور ننگے سر داؤ جی بکریوں کے پیچھے یوں چلے' جیسے لمبے لمبے بالوں والا فریدا چل رہا ہو۔" (ص 240)

☆ دوسرے یہ کہ قرۃ العین حیدر کے ڈاکٹر آفتاب رائے جاگیرداری کلچر کے نمائندے ہیں۔ تعلیم یافتہ' مہذب' شائستہ' نفیس اور بڑے دل والے' اپنے جذبات کو چھپانے والے ---- داؤ جی نچلے طبقے کا ایک فرد ہے۔ جا وبے جا اپنی محبت چھڑکنے والا' اپنی بیوی سے مار کھانے اور جھڑکیاں سننے والا (ہوائیں چلنے کو ہوتی ہیں بیٹا اور گالیاں برسنے کو' تم انہیں روکو مت' ٹوکو مت۔" ص 174) ہردم' ہر لحہ اپنی اوقات یاد رکھنے والا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ معلم ہونے کے ناتے ہر وقت بولنے والا -----!

اصل میں اشفاق احمد کے فلسفہ حیات کا محور' محبت ہے' اس کے نیرنگ ایک تازہ افسانے' ماسٹر روشی' میں ایک جگہ انجیل کے حوالے سے بالالتزام یہ بات کہی جاتی ہے کہ "اگر میں سارے جہاں کی بولیاں بولوں اور تمام دنیا کے علم حاصل کرلوں' لیکن محبت نہ کروں تو میں ٹھنٹھناتا ہوا پیتل اور جھنجھناتی ہوئی جھانجھ ہوں" (1971 کے منتخب افسانے' ص 28)

چنانچہ داؤ جی کے علم کا جادو بھی محبت کے اسم اعظم کے طفیل ہوتا ہے۔ یہی نہیں اشفاق احمد کے افسانے' عجیب بادشاہ' میں بھی ایک آئیڈیل استاد پروفیسر دیس راج۔ محبت اور علم کا مجسمہ بنا کر پیش کیا گیا ہے' جسے ہم داؤ جی کے کردار کا ابتدائی نقش کہہ سکتے ہیں۔ محبت کے اسی غیر معمولی اور گرجوش اظہار کو دیکھ کر "بابا" کی دلہن اپنے شوہر وحید سے پوچھتی ہے "تمہارے دیس میں سارے دادے اپنے پوتوں سے ایسا ہی پیار کرتے ہیں؟" (بابا۔ ایک محبت سو افسانے۔ صفحہ 202)

☆ اسی طرح گھریلو ناچاقی کے سبب اپنے بیٹے کو ——— بے دردی سے مارنے والا باپ' عمر بھر محبت سے آنکھیں نہیں ملا سکتا اور لٹ لٹا کر سرحد پار آتا ہے' تو دنیا جہان کا کرب اس کی اس صدا میں مجسم ہو جاتا ہے۔" ماسٹر جی میں پڑھا لکھا مہاجر ہوں' مجھے اپنا ماتحت رکھ لیجئے' میں اپنے بیٹے کو بالکل مارتا نہیں۔"

(پناہیں ——— ایک محبت سو افسانے ص 256)

یہی محبت اسی کے منہ بولے جواری بیٹے کے لبوں پر آخری موت سے مہلت کی اپیل بن کر زاری کرتی ہے۔ یہی محبت ٹی بی وارڈ میں ہیٹرس کو اتنی قوت اور اعتماد بخشتی ہے کہ وہ نہ صرف ناک پر حفظ جان کا رومال نہیں رکھتی۔ بلکہ اپنا خون بھی مریضوں کو دیتی پھرتی ہے' یہ محبت انسانی اور جسمانی سطح پر بھی ہے' مگر اشفاق احمد کے محبت کرنے والے تمام کردار اپنے دکھ اور مال سے پہچانے جاتے ہیں۔

اشفاق احمد کے ہاں اجتماعی معاشرت کا گہرا مشاہدہ جلوہ گر ہے' اگرچہ اس نے شعوری طور پر ترقی پسند ادیبوں کے ہجوم میں گھرنا پسند نہیں کیا' تاہم سیاسی حوالے اس کی بعض کہانیوں میں موجود ہیں' جیسے اس کے پہلے ہی افسانے "توبہ" میں مسلم لیگ کا ذکر یوں آیا ہے۔ "کیا نام" لیگ کا سب سے بڑا افسر آیا تھا۔ ہماری تو ساری کی ساری برادری' کیا نام' ادھر ہی ووٹ دے گی۔ اپنے باپ دادا تو سالے ساری عمر بکتے ہی رہے ہیں' پر ہم سے تو وہ نہیں ہو سکتا کہ اتنے رتبے کے آدمی کی وہ نہ مانیں اور دو ربلی لے کر بھگا جائیں۔"

(ایک محبت سو افسانے' --- ص 16۔ 17)

داؤ جی کے اپنے بیٹے ای چند کے رویے میں ہندو مسلم کشیدگی کا تاؤ ملتا ہے' چنانچہ داؤ جی کہتے ہیں "اس کے خیالات کچھ مجھے اچھے نہیں لگتے' یہ سیوا سنگ' یہ مسلم لیگ' یہ بیلچہ پارٹیاں مجھے پسند نہیں۔" (اجلے پھول۔ ص 204)

☆ 1947ء کے فسادات پر ہر طرح کے افسانے لکھے گئے ہیں۔ "دکھ بڑھانے والے" زخموں پر پھاہے رکھنے والے' کچوکے لگانے والے' آس بندھانے والے' رقت سے کام لینے والے' کلبیت کا مظاہرہ کرنے والے اور تاریخی بصیرت کو بروئے کار لانے والے ـــــ اشفاق احمد کے دو افسانے "گڈریا" اور "بابا" تو درد کے انتہائی حدود کو چھوتے دکھائی دیتے ہیں۔ البتہ "سنگ دل" بھی کے رویے کے طفیل ترقی پسند افسانہ نگاروں کے تخلیقی رویے سے مماثل دکھائی دیتا ہے۔ بہر طور یہ اشفاق احمد کی خوبی ہے کہ اس نے قیامت کے اس منظر کو کسی بے رحم مصور کی طرح تمام رنگوں اور خطوں سے مجسم کر دیا ہے۔

"خاک کے ذرات' چنگاریوں کی طرح گرم اور نیزے کی انیوں کی طرح نوکیلے' پسینے سے تر' جسموں میں نشتروں کی طرح اترتے چلے جا رہے تھے۔ اس پر رائفلوں کی سیٹیاں بجاتی گولیاں اور سٹین گن کی تڑ تڑ کرتی باڑھیں' انسان تھے۔ سانس روکے سب برداشت کرتے گئے' بچے پیاس کی شدت سے چلا رہے تھے۔ ان کی ماؤں کا ایک ہاتھ ان کے منہ پر بھنچا ہوا تھا۔ دوسرا برقعہ سنبھال رہا تھا۔" ('بابا' ـــــ ایک محبت سو افسانے۔ ص 228)

☆ "دور دور تک آگ ہی آگ دکھائی دیتی تھی۔ اس کے پیچھے مرنے مارنے والوں کا شور و غل" ایسے لگتا تھا' جیسے آسمانوں پر جہنم مکمل ہو چکا ہو۔ اور اب زمین پر اس کا سنگ بنیاد رکھا جا رہا ہو۔"

(تلاش' ایک محبت سو افسانے ـــ ص 56)

"باوجود اس کے کہ اپنی آنکھوں نے دیکھا تھا۔ یقین نہیں آتا تھا ٹرک چل رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے نہ چل رہے ہوں' مغویہ لڑکیاں برآمد کی جا رہی ہیں۔ شاید نہ کی جا رہی ہو پاکستان بن گیا ہے' کیا پتہ ہے نہ بنا ہو"۔

"سنگ دل"۔ ایک محبت سو افسانے۔ ص 92)

اشفاق احمد بھی تقسیم کے بعد یادوں کی جانب پلٹ کر دیکھتا ہے جہاں داؤ جی' پروفیسر دیس راج' بی' اور چاچی رہ گئے ہیں' مگر وقت کے ساتھ ساتھ اس کے زخم اس لئے بھرتے چلے جاتے ہیں کہ اس کی محبت کا مرکز دھرتی اور اس کی کوکھ سے جنم لینے والی تہذیبی قدریں اور رسمیں نہیں' افراد ہیں (تھے) ـــــ قیام پاکستان کے بعد ہوس زر نے جس طرح امیدیں' آرزوؤں اور خوابوں کو چاٹا' (اور جس پر انتظار حسین نے اپنا لازوال افسانہ "بن لکھی رزمیہ" تخلیق کیا) اس کی کچھ جھلکیاں اشفاق احمد کے افسانوں میں بھرپور طریقے سے دکھائی دیتی ہیں۔

☆ "ابا جان نے لکھا تھا کہ بڑے سوچ بچار کے بعد' انہوں نے سنت نگر میں میری نسبت توڑ دی تھی۔ کیونکہ اس شادی سے ہمیں کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچ رہا تھا۔ اب وہ ایسے آدمی کی تلاش میں تھے جو حکومت کے کسی بھی بڑے محکمہ میں پرمٹ آفیسر ہو' تاکہ اس کی بدولت ہمیں بھی سرکاری فائدہ پہنچ سکے۔ (ص 219) ..... بعد میں معلوم ہوا کہ وہ افسر ایک سال کے اندر اندر ریٹائر ہونے والا ہے۔ اس لئے ارادہ ترک کر دیا۔

("ایل ورا"۔ اجلے پھول۔ ص 296)

☆ "جس الماری میں چیک بک' ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ۔ آدم جی شوگر مل کے شیئرز نٹ یونٹ' ای ایف یو اور پالیسی اور مکان کی رجسٹری تھی۔ اس کا پٹ کھولو۔ تو اس میں سے بھی ایسی ہی ٹھنڈی ہوا آیا کرتی ہے چاہے موسم کوئی بھی ہو۔" ("ماسٹر روشی"۔ 1971ء کے منتخب افسانے۔ ص 43)

☆ "رفتہ رفتہ اشفاق احمد کے سماجی شعور نے IRONY کو اپنا ہتھیار بنا لیا ہے۔ چنانچہ اب اس کا تلقین شاہ ہی اس کی پہچان بن گیا ہے۔ "ماسٹر روشی" میں بھی یہ ہی زہر خند ہے۔ درد کے طوفان کے سامنے بند باندھتا دکھائی دیتا ہے۔ ہمارے ثقافتی محاذ پر داد شجاعت اور داد عیش دینے والے کردار' جب مالی مدد کے لئے اپیلیں کرتے ہیں۔ اور ان کی مختلف رغبتوں کو نظر انداز کر کے' جب بہت سے لوگ اور ادارے مضطرب ہو کر کاوشیں کرتے ہیں تو تیس سال تک چارپائیوں کے پائے بنانے والے بابا ابراہیم موتیا بند سے ہار کے لجاجت آمیز لہجے میں ہم سب کا دامن پکڑ کر کہتا ہے۔" بچی کو روپے میرے نام بھی لگوا دے۔ میرا نیم پاس ہو جائے گا۔ (ص 45)

☆ ماڑوں اجنبی کے آغاز میں پاکستان کے گرم پانیوں میں موجود جزیرہ شیریں۔ اسلام آباد کی نمائندہ مخلوق کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے۔" وہ بھی وٹامن کھاتی تھی۔ وہ بھی کولون لگاتی تھی' اس کو بھی منسٹری سے بلاوا آیا تھا۔ اس نے بھی پی سی ون فارم غلط بھر دیا تھا۔ اس کو بھی ایک سال کی ایکسٹینشن مل گئی تھی۔ وہ بھی خوش دلی سے ڈھاکہ فال کا صدمہ سہ گئی تھی" (1977ء کے شاہکار افسانے۔ ص 9)

اشفاق احمد کے بیشتر نکتہ چیں یہ گمان کرتے ہیں کہ اس نے "متصوفانہ رویہ" بعض عملی مقاصد کے حصول اور سیاسی مقاصد کی تکمیل کی خاطر اپنایا ہے' وہ "مختلف اسباب" کی بنیاد پر اپنے تازہ ترین افسانوی میڈیم' ٹی وی ڈرامے' کے ذریعے قاتلوں کو معافی دینے کی اپیل کرتا ہے۔ ملا کو ہیرو بنا دیتا ہے۔ آئن سٹائن کو صوفی ثابت کرتا ہے۔ مغربی علوم و فنون

کی نارسائی کا ذکر شد و مد سے کرتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اشفاق احمد کے ہاں تصوف سے رغبت گزشتہ چھ سات برسوں میں بڑھی تو ہے۔ مگر پیدا انہی برسوں میں نہیں ہوئی' داؤ جی بھی ایک صوفی کردار ہے "فہیم" کے نانا جی بھی درویش کی خدمت گزاری کے لئے نوکری چھوڑ دیتے ہیں۔ "ایلی دیرا" میں بھی صوفی کے دل اور یوگی کی آنکھ کا ذکر ملتا ہے (ص 284)

پھر محبت اور انسانیت سے اس کا والہانہ لگاؤ بھی اسے صوفیوں سے محبت کا اہل بناتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے قریبی دوست قدرت اللہ شہاب اور ممتاز مفتی بھی اس مسلک کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں (؟) ۔ تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان برسوں میں اشفاق احمد کا صوفی' ملا بن بیٹھا ہے۔ اور یوں مجھے اس کے ایک افسانے "مسکن" کے ایک کردار کا ایک مکالمہ یاد آرہا ہے۔

"تم نے مجھے اس قدر کمزور کیوں کر سمجھا؟
کیا مجھ میں نبرد آزمائی کی قوت نہیں؟
کیا میرے کندھوں پر ایک شاطر کا سر نہیں؟"

(ایک محبت سو افسانے۔ ص 100)

بہر طور اشفاق احمد کا افسانہ بیا جاناں' اس متصوفانہ واردات کو لئے ہوئے ہے۔ جسے بعد میں اشفاق احمد نے اپنے ٹی وی ڈراموں کے ذریعے اجاگر کیا ---- مغربی قدروں اور ثقافتی رَوِیوں کے خلاف اشفاق احمد نفرت کے جذبات رکھتا ہے۔ حالانکہ وہ اس "جہنم" میں جلنے والے کرداروں کے سامنے اپنے آپ کو ہم درد معالج بن کر پیش کرتا ہے' پر حقیقت میں وہ انہیں اور کچوکے لگاتا ہے۔ اور آخر میں یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ عصر حاضر کی صنعتی ترقی انسانیت کے لئے قاتل ہے:

"یہ جتنا بھی گلٹ (GUILT) اس دنیا میں موجود ہے' سیکس اور پالیٹکس اور انفریشن کی وجہ سے ہے۔ ہر تیسرا آدمی السر کا شکار ہے اور ہر چوتھے آدمی کی شریان پھٹ رہی ہے اور ہر پڑھا لکھا ہارٹ اٹیک سے مر رہا ہے۔ ہمیں ضرورت سے زیادہ انفریشن نے روگی بنا دیا ہے" (قصہ گل دیمتی' ---- سفر مینا ص 171)

لوگوں کی بجائے چیزوں پر جان دینے والوں اور اشتہاروں کی اکساہٹ پر زندگی میں دیوانہ وار بھاگنے اور دوڑنے والوں سے اسے بظاہر ہمدردی ہے۔ مگر حقیقت میں وہ ان کے خلاف بغض رکھتا ہے۔ ایسے گھرانوں کے آئیڈیل کیا ہیں۔ ان کا ذخیرہ الفاظ کیسے بڑھتا اور گھٹتا ہے' اور ان کی ترجیحات حیات کیا ہیں؟ ان سب کا ذکر کرتے ہوئے اشفاق احمد اپنی تلخی چھپا نہیں سکتا۔

☆ "سونی' وی سی آر کے لئے استعمال کا لفظ سن کر اور اس دیدہ دلیری سے دگر طریقہ پر سن کر بختیار کی روح بلبلا اٹھی" ("سونی" ۔ ادب لطیف۔ اپریل 83 ۔ ص 59)

☆ "شائستہ امریکی رسالہ ٹائم کی طرح خوبصورت' جھوٹی اور خوشبودار تھی" (قصہ گل دیمتی۔ سفرمینا۔ ص 163)

☆ "یہ محرومی کا لفظ تم نے کہاں سے سیکھا؟" شائستہ نے شرما کر کہا۔ "ٹیلی ویژن کے پروگرام "بصیرت" میں ایک مولوی صاحب نے یہ لفظ استعمال کیا' جو مجھے اچھا لگا اور میں نے اسے یہاں استعمال کر دیا۔"
(ایضاً ۔ ص 168)

اگرچہ اشفاق احمد ان لوگوں کا مذاق اڑاتا ہے۔ جو اجتماعی احوال کے آئینے میں انفرادی طرز عمل کا عکس دیکھتے ہیں۔ "جب میری اور تیری محبت کا افسانہ عام ہوگا تو مستقبل کے نقادوں کو اور مبصروں کو آج کے سیاسی' معاشرتی' اور اقتصادی حالات سمجھنے میں بڑی آسانی ہوگی۔ ان کو زور لگا لگا کر پرانے قصوں اور قدیم داستانوں سے اس وقت کی گھٹن کے آثار' علامتوں میں تلاش کرنے کے بجائے سیدھے بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔ کہ سیسل شائستہ پر جان کیوں دیتا تھا۔" (ایضاً۔ ص 172)

تاہم اشفاق احمد سماجی امتیازات۔ عدم مساوات' ناانصافی اور ریاکاری کے خلاف آواز بلند کرتا ہے تو اسی لئے کہ یہ کسی فرد کی روح کو مسخ کر دیتے ہیں' وہ "گا تو" میں محلات میں بسنے والے ان لوگوں کے خلاف اپنی نفرت کو چھپا نہیں سکتا جو اپنے ماتحتوں کے معصوم بچوں کی خواہشوں کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ وہ "محسن محلہ" کی ریاکاری کو فراموش نہیں کر سکتا جو اپنے سب سے زیادہ معصوم مکین ماسٹر الیاس کو بے بسی کی موت تو مرنے دیتا ہے' پر اس کی رسم قل کے لئے آٹھ سو گیارہ روپے کا چندہ جمع کر لیتا ہے' اسی طرح "کالج سے گھر تک" میں خواب و خیال کی دنیا سجانے والے ہر فرد کے المناک تضادات جس خوبی سے پیش کئے گئے ہیں اس پر پختہ سماجی شعور رکھنے والا افسانہ نگار ہی قادر ہے۔

آخر میں میں اشفاق احمد کے ایک افسانے قاتل کا اقتباس پیش کرتا ہوں' جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ محض ہمارے ہاں مروج قانونی موشگافیوں اور نظام انصاف کی بیساکھیوں سے ہی آشنا نہیں۔ اس کا ہاتھ پاکستانی کردار

کی نفسوں پر بھی ہے' ایک کرایہ دار خاتون مالک مکان کے ساتھ جھگڑنے کے بعد پولیس میں رپورٹ درج کراتی ہے۔

"مکان پر دو فریقین' ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں۔ بلکہ ایک دیوار مشترکہ رکھتے ہیں۔ بوجہ موسم گرما فریقین اپنے اپنے کوٹھوں پر رات کو سوتے ہیں۔ مستغیثہ باعزت بیوہ ہے' ملزم صبح اٹھ کر اپنے کوٹھے پر مستغیثہ کی جانب منہ کر کے ہر روز بہ نیت توہین شرمساری مستغیثہ برہنہ ہو کر پیشاب کرتا ہے۔ جس سے شرمساری کی توہین ہوتی ہے' چنانچہ کل صبح کو ملزم مذکورہ اسی طرح پیشاب کر رہا تھا۔ مستغیثہ کے منع کرنے پر فحش گالیاں بہ نیت توہین بالقصد دینی شروع کر دیں۔ لہٰذا استدعا ہے کہ ملزم کو سزائے قانونی دی جائے۔"

(سفر نامہ۔ ص 153)

اشفاق احمد کی سفرنامہ نگاری

منور عثمانی

ممتاز افسانہ نگار اور متنازعہ ڈرامہ نگار اشفاق احمد منفرد اور مختلف نوعیت کے سفرنامے لکھ کر ادب کی صنف سفرنامہ نگاری میں بھی اپنی معتبری قائم کر چکے ہیں ــــــ اشفاق احمد کی سفرنامہ نگاری ان کے مخصوص رویوں، ماضی کی یادوں، افسانوی رنگوں اور تاریخی و تہذیبی جلووں سے عبارت ہوئی ہے۔ انھوں نے سفرنامے نسبتاً کم لکھے لیکن ان کے اسلوب انداز نظر اور ذاتی حوالوں نے صنف سفرنامہ نگاری کو ایک نئے مزاج نرالے طور طریق اور نئی طرز کلام سے متعارف کرایا ہے۔ "سفر در سفر" کے علاوہ "سفر مینا" میں اشفاق احمد کے سات سفرنامے ہیں جن کی تکنیک، معاشرت نگاری اور اسلوب اردو کے دیگر سفرنامہ نگاروں سے مختلف ہے۔

اشفاق احمد صنف سفرنامہ نگاری کے وسیع کینوس میں رنگ بکھیرنے کا ڈھنگ جانتے ہیں اور یہ صنف اس اعتبار سے بھی ان کے لئے اہمیت رکھتی ہے کہ اس میں اشفاق احمد اپنے ہمہ گیر تجربوں، رنگا رنگ مشاہدوں اور تخیل میں ابھرنے والی ان تصویروں کو بھی پینٹ کر سکتے ہیں جن کی گنجائش مخصوص حدود و قیود کے باعث افسانہ یا ڈراما میں نہیں ہے۔

ان کے سفرناموں کی تکنیک عام سفرناموں کی بندھی اور روایتی تکنیک سے یکسر مختلف ہے۔ یہ افسانوں کی طرح بات کہیں سے بھی شروع کر کے کسی بھی مقام پر ختم کر دیتے ہیں اور اس کے لئے قطعاً اس بات کی ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ بیان کا آغاز وہاں سے کیا جائے جہاں سے سفر شروع ہوا۔ یا سفرنامہ میں زمانی، مکانی یا واقعاتی ترتیب کو امتحان کے لازمی سوال کی طرح ہر صورت میں ملحوظ رکھا جائے اور جغرافیائی حد بندیوں اور خارج کے خشک بیان کو ہی سفرنامہ نگاری کا مقصود و منتہا سمجھا جائے۔

ان کے سفرناموں میں کہیں تو عام بیانیہ انداز ہے کہیں پر مکالماتی اور خط یا ڈائری لکھنے کی طرز اور بعض مقامات پر داستان گو کی طرح قصہ کہنے یا عام سامع کی مانند بڑی بے چینی اور بے صبری سے کہانی سننے کا انداز ملتا ہے۔

"بے تو رد" میں ہوٹل کا منیجر مصنف کو ایک کہانی سناتا ہے اور کہانی کے اختتام پر یہ سفرنامہ ختم ہو جاتا ہے۔ "سواد روضۃ الکبریٰ" میں شروع میں بیانیہ انداز، پھر ایک طویل خط اس کے بعد ریڈیو سٹیشن کے کمرہ میں براڈ کاسٹروں کے درمیان مکالمے اور پھر تقریباً پانچ دن کی الگ الگ ڈائری ہے اس رپورتاژ میں چار تکنیکوں سے رنگا رنگی پیدا کی گئی ہے۔ اور مصنف کا مدعا بھی مختلف طریقوں سے روشن ہو گیا ہے۔

"سفر در سفر" میں تکنیکیں ہی نہیں مختلف اصناف بھی یکجا ہو گئی ہیں۔ اس میں آپ بیتی کا رنگ بھی ہے چھوٹے چھوٹے کئی افسانے بھی ہیں۔ تاریخی ناولوں کی طرح تاریخ، شاہ و عوام اور جنگوں کے جذباتی بیان بھی ہیں۔ صوفیانہ ادب کی جھلکیاں بھی ہیں اور خوبصورت مکالموں سے ڈرامائی کیفیت بھی پیدا کی گئی ہے۔

اشفاق احمد کے سفرناموں میں خارج کے تذکرے کے دوران اچانک "داخل" کا طلسماتی ساتواں در کھل جاتا ہے۔ "حال" کا قصہ ختم ہوتے ہی فلیش بیک میں "ماضی" زندگی کی ساری رعنائی کے ساتھ آن کھڑا ہوتا ہے۔ کسی واقعہ سے مستقبل کے خدشات جاگ جاتے ہیں۔ اور مصنف اپنی بصیرت سے آئندہ کے واقعات قبل از وقت ہی دیکھ لیتا ہے لیکن اس قصہ خوانی کے باوجود نہ تو سفرنامہ کے متحرک کو کوئی گزند پہنچتا ہے اور نہ ہی بیان کی روانی میں فرق پڑتا ہے۔

اشفاق احمد کے سفرناموں میں خارجی معاشرت نگاری اور جغرافیائی معلومات کا اظہار دیگر سفرناموں کی نسبت قدرے کم ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کی توجہ کسی جگہ کی سیر کرتے ہوئے وہاں کے جغرافیہ کے بجائے تاریخ پر علاقہ

کی بجائے باشندوں پر اور سیاست و حکومت کی بجائے افراد کی زندگیوں اور ذہنی رویوں پر ہوتی ہے' وہ جن چیزوں' کاموں' نظاموں اور انسانوں سے فکری اور قلبی طور پر متاثر ہوتے ہیں۔ ان کا اظہار تفصیل کرتے ہیں۔ باقی باتوں کا تذکرہ یا تو اجمالی ہوتا ہے یا سرے سے ہوتا ہی نہیں۔ اس طرح قاری اشفاق احمد کے نقطۂ نظر' فکر و فقر' اور مخصوص عقائد سے بخوبی آگاہ ہو جاتا ہے اور یوں ان کا سفرنامہ انکشاف ذات کا وسیلہ بھی بن جاتا ہے۔

اشفاق احمد کے سفرناموں میں انکے جذباتی رویوں اور شخصی حوالوں کے باعث سفرنامہ کسی سیاحتی ادارے کا اطلاعاتی کتابچہ بننے کی بجائے ایک تخلیقی اور رومانی منظرنامے کا روپ دھار لیتا ہے۔ اشفاق احمد کے سفرناموں میں خارجیت نگاری سرے سے ہی مفقود نہیں ہے ان میں خارجی زندگی سے بھرپور جیتی جاگتی جھلکیاں بھی ملتی ہیں جو کہ اشفاق احمد کے مشاہدہ کی باریک بینی کا ثبوت مہیا کرتی ہے۔

"چلتو پاکستان" میں چینی شہر "ادہان" کے گرم موسم اور چینی کسانوں کے کتاب پڑھنے کے نرالے انداز "سواد رومتہ الکبریٰ" میں روم کی معاشرت اور سیاست کے مختلف رخ "عرش منور" میں بل فائٹنگ کا ایک متحرک منظر "سفر در سفر" میں جدید کا لکڑی کا کارخانہ' وسیع و عریض گلیشرز' کاغان کے راستے میں گورنمنٹ ہیچری میں مچھلی کے بچوں کی پیدائش اور گوجروں کے قافلوں کا تذکرہ نہایت فنکارانہ چابکدستی سے کیا گیا ہے۔

"خوابوں کا جزیرہ" امریکہ اور اسکی نام نہاد خوبصورتی' خوشحالی اور آسودگی کے متعلق خاصے اہم انکشافات پر مبنی رپورتاژ ہے۔ اسی طرح "چچا سام کے ساتھ" میں مغرب کی بے حیائی اور بے حجابی پر اچٹتی ہوئی نظر ڈالی گئی ہے۔

"بڈھے نے میرے کندھے پر ہاتھ مار کر پوچھا! تمہارے دیس میں بھی رواج ہے کہ مرد اندر سے غسل خانے کا دروازہ بند کر لیتے ہیں۔" (سفر چینا ص۔126)

اشفاق احمد کا سفرنامہ کسی علاقہ کی عمارات' تاریخی مقامات' تقریبات اور رسوم و رواج کا کوائف نامہ بننے کی بجائے جیتے جاگتے لوگوں کے رویوں' سوچوں اور مزاجوں کا نباض نظر آتا ہے چینیوں کی قوت برداشت اور تحمل مزاجی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ان کی Short comings بتاتے ہوئے پارٹی سے لیکر نظام اشتراکیت تک اور ملک چین کی بے عزتی سے لیکر کیونوں کا ٹھٹھا اڑانے تک چاہے جتنی مرضی چمڑی ادھیڑے جاؤ چینی سامعین بڑے سلوک سبھاؤ اور نرم روی کے ساتھ آپ کی ساری باتیں سنتے جائیں گے۔ ہاں جب ماؤزے تنگ پر تنقید کرو کہ وہ ڈکٹیٹر ہے آمر ہے تو ان کے دلوں میں اک ہوک سی اٹھتی ہے۔ آنکھوں میں دکھ سا تیرنے لگتا ہے پر وہ یہ سب کچھ بھی سہ لیتے ہیں۔

☆ ——————(چلتو پاکستان سفر چینا ص 111)

سفرناموں میں اشفاق احمد کا تاریخی شعور زیر زمین برقی رو کی مانند عبارت کو آب و تاب عطا کرتا رہتا ہے یہ کسی التزام اور اہتمام کے ساتھ تاریخی واقعات کو بیان نہیں کرتے بلکہ مکالموں اور یادوں میں اچانک یہ واقعات در آتے ہیں:

"غیاث الدین تغلق پنجاب کا کیسے ہو گیا تیرا باپ؟ لیڈر نے کڑک کر کہا۔ میں نے کہا"...... غیاث الدین کا باپ سلطان بلبن کا ایک غلام تھا جس نے پنجاب کی ایک جاٹنی سے شادی کی تھی...... غیاث الدین اس جٹی کے بطن سے پیدا ہوا۔ اور اپنی ماں کے زیر سایہ ساہیوال کے علاقے میں ہی میں پرورش پاتا رہا۔ بعد میں یہی ہونہار اور شیر دل جوان دیپالپور کا حاکم مقرر ہوا۔"

——————(سفر در سفر ص 188)

اشفاق احمد کے سفرناموں میں "آپ بیتی" کا عنصر اور انداز بیان بھی نمایاں ہے "عرش منور" میں ان کے دادا اور پردادا کا تذکرہ ہے کہ ان دونوں کے مزاجوں میں کتنا فرق تھا۔ پردادا سپاہی تھا اور اس کا بیٹا ابن رشد اور غزالی کا قاری۔ پردادا اس صحت مند بیٹے کو تلوار چلانے اور وار روکنے کا فن سکھانا چاہتا تھا لیکن بیٹے نے تیغ و سناں کو علم و دانش کی محبوبہ کے قدموں میں ڈال دیا تھا۔ اشفاق احمد نے اس تذکرے کے ضمن میں اپنے دادا کی شادی' پھر ان کا گھر سے فرار' حیدر آباد دکن میں قیام' فالج کا حملہ اور گھر واپسی ان تمام واقعات کو چند پیروں میں بیان کر دیا ہے۔

"سفر در سفر" میں اس دردناک شام کا نقشہ کھینچا ہے جس شام ان کے بڑے بھائی آفتاب احمد ہمیشہ کے لئے ان سے بچھڑ گئے تھے۔ "سفر در سفر" میں ہی اپنے آٹھویں جماعت کے اس زمانے کا تذکرہ بھی کیا ہے جب ان کے گھر ان کی بڑی آپا کی سہیلی باجی سلمی آئیں تو آٹھویں جماعت کے اس طالب علم میں کئی تبدیلیاں آ گئیں۔ یہ صاف ستھرا رہنے لگا۔ کھیل کود چھوڑ دیا۔ ماں باپ کا کہا ماننے لگا۔ اور اپنے ہر کام کو باجی سلمی کے نام معنون کرنے لگا۔ لیکن اس کے جانے کے بعد یہ ناسمجھ اور بظاہر بے شعور

لڑکا چھت پر جا کر بہت رویا، بہت تڑپا اور اس کے وجود میں اداسی اور تنہائی جاگزیں ہو گئی۔

آپ بیتی میں اعترافات کو نمایاں مقام حاصل ہوتا ہے۔ اور اعترافات کی سچائی ہی آپ بیتی کے منصب کا تعین کرتی ہے۔ اشفاق احمد کے سفرنامے میں آپ بیتی کا رنگ صرف ماضی کی یادیں ہی نہیں اجاگتا بلکہ مصنف کی خامیوں اور تقصیروں کا سچا اعتراف بھی کرتا ہے۔

اشفاق احمد "سفر در سفر" میں لکھتے ہیں:

"مجھے شروع ہی سے محبت اور منافقت پسند ہے اور میری انا نے آج تک کبھی یہ برداشت نہیں کیا کہ میرے ہوتے ہوئے کسی اور کی تعریف ہو۔ کسی اور کی بات ہو۔ اور اس گفتگو میں میرے ہی دوست شریک ہوں۔

(سفر در سفر ص46)

پیسہ کمانے اور جمع کرنے کا الزام کا اعتراف ان مکالموں میں ملتا ہے۔

"ہاں سچ ----- عماد نے سنجیدگی سے کہا "آپ اس قدر لالچی اور پیسے کے چکر کیوں ہیں؟" میں نے کھسیانی ہنسی ہنس کر کہا دراصل یہ خاصیت میرے ساتھ پیدا ہوئی ہے اور چونکہ میں نے اسے دور کرنے کی کوشش نہیں کی اس لئے یہ اور بھی راسخ ہو گئی۔ اب میں حصول زر کے چکر سے نکل نہیں سکتا..... حصول زر اور جلب منفعت کو کتابی طور پر برا سمجھتا ہوں جذباتی طور پر نہیں۔

(سفر در سفر ص 73 ـ 74)

اس نوعیت کے متعدد دیگر اعترافات سے اشفاق احمد کی شخصیت اپنی اصل صورت میں قاری پر منکشف ہو جاتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اپنی خامیوں، تقصیروں اور کمزوریوں کا اعتراف کرنے والی اس وسیع القلب شخصیت کی عظمت بھی قاری کے دل پر مرتسم ہو جاتی ہے۔ بقول شاہین مفتی:

"پر لطف بات یہی ہے کہ اشفاق جس قدر اپنی برائیوں، خود غرضیوں، حماقتوں اور خود ستائیوں کو بے نقاب کرتا ہے۔ اسی قدر پیارا اور عزیز لگنے لگتا ہے"

(فنون سنہ 1982 ص 336)

اشفاق احمد کے سفرناموں میں افسانوی عنصر بہت نمایاں ہے۔ سفرناموں کو عام طور پر ایسی صنف قرار دیا جاتا ہے جس میں سفرنامہ اور افسانہ ہاتھ ملائے نظر آتے ہیں۔ لیکن اشفاق کے ہاں سفرنامہ اور افسانہ مصافحے کی بجائے معانقہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ "سفر در سفر" میں تو کئی مختصر افسانے ہیں جنہیں علیحدہ بھی شائع کیا جا سکتا ہے۔ لیکن سفرنامہ نگار نے ایک خاص التزام کے تحت سیاحت کے تذکروں کے مابین کہانی اور کہانیوں کے درمیان سیاحت نامہ کو بڑی چابکدستی اور فنکارانہ مہارت سے پرو دیا ہے اور اسے ایک خوشنما تسبیح کا روپ دے دیا ہے۔ اس تسبیح کا دھاگہ کھول کر دانے علیحدہ کئے جا سکتے ہیں اور ہر دانے کا اپنا الگ تشخص بھی بن سکتا ہے لیکن یکجا ہوئے یہ دانے اور پروئی ہوئی یہ تسبیح زیادہ بھلی اور پیاری لگ رہی ہے۔

"سفرِ مینا" کے سفرنامے بھی افسانویت کے حامل ہیں۔ اور ان سفرناموں کو افسانوی مجموعہ میں شامل کرنے کا سبب بھی یہی ہے کہ سفرنامے افسانوں کے رنگ میں پھیل گئے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید اشفاق احمد کے اسی رویے کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اشفاق احمد چونکہ بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں۔ اس لئے وہ سفر کو بھی کہانی کی تلاش کا وسیلہ بناتے ہیں اور مناظر و مظاہر کے بیانیہ میں کرداروں کی شمولیت سے اسے حقیقی افسانے کا انداز عطا کر دیتے ہیں۔ اشفاق احمد نے سفرنامے کو افسانے کی حدود میں ہی داخل نہیں کیا بلکہ متخیلہ کے کثیر استعمال سے اس کی محدود ابعاد کو لامحدود کر دیا ہے۔"

(اردو ادب میں سفرنامہ ص 412)

سفرناموں میں اشفاق احمد کے اسلوب کا نمایاں پہلو شگفتگی ہے۔ لیکن اس شگفتگی کا ٹھٹھا مخول اور جگت بازی سے کوئی تعلق نہیں ہے یہ شگفتگی تو عبارت کو رواں دواں چنچل مہکتی اور شاداں و فرحاں بنا دیتی ہے۔ بات کیسی بھی ہو اس کے جلو میں ایک تبسم کیفیت ضرور ہوتی ہے۔ بیان جو بھی ہو اس پر مصنف کی خوش مزاجی کے رنگین کاغذ ضرور چڑھے ہوتے ہیں۔ اس لئے قاری ان سفرناموں میں خوشی خوشی وہ باتیں بھی پڑھ لیتا ہے اور ان سے محظوظ بھی ہوتا ہے جن سے عام زندگی میں اسے شدید نظریاتی اختلاف ہوتا ہے۔

اشفاق احمد کے سفرناموں کی زبان افسانوی، سادہ، رواں اور شستہ ہوتی ہے۔ موقع و محل کا سانچہ دیکھ کر اپنا روپ بدل لیتی ہے اس لئے اشفاق کو زبان و بیان کے کرشمے دکھانے کا سب سے زیادہ موقع سفرنامہ میں ہی ملتا ہے۔ کسی بات کو شعری لمس مہیا کیا جاتا ہے کسی واقعہ کو جذباتی لفظوں کی خلعت پہنائی جاتی ہے کہیں حکیمانہ لہجہ میں بات کی جاتی ہے کسی مقام پر دھیمی سی سرگوشی اہم راز کو فاش کر کے غضب ڈھا دیتی ہے۔ بات پرانی بھی کی جائے لیکن لفظوں کی بساط نئی ہوتی ہے اور کہنے کا ڈھب نرالا

ہوتا ہے۔

بیان میں تشبیہات کی رنگ آمیزی بھی اپنی بہار دکھا رہی ہے۔ اشفاق احمد کو تشبیہات برتنے میں خاصا درک حاصل ہے۔ ان کی تشبیہات تازہ، منفرد اور جاندار ہوتی ہیں۔

"نیموں کے پیڑ یتیم خانے کے مدرسے میں حمد کہنے والے بچوں کی طرح کھڑے تھے"

(سفرِ مینا ص 64)

"پریدہ رنگ، دریدہ چشم، قلندر کی نگاہ میرے دل میں خسرو کی نعت بن کر چھری کی طرح اتر گئی۔"

(--- سفرِ مینا ص 49)

منفرد تشبیہات کے استعمال کی طرح جزئیات نگاری بھی اشفاق احمد کا پسندیدہ شوق اور ان کے اسلوب کا لازمی عنصر ہے۔ سفرناموں میں یا تو سفرنامہ نگار کی نظر بڑے بڑے پہاڑوں پر نہیں ٹکتی یا پھر معمولی شے کا تفصیلی بیان اس طرح کیا جاتا ہے کہ وہ غیر معمولی نظر آنے لگتی ہے۔ یہ جزئیات نگاری ناخوشگوار طوالت کا سبب نہیں بنتی بلکہ بات کو بامعنی اور تحریر کو باتصویر بنا دیتی ہے۔

"سفر در سفر" یاں اشفاق احمد کے لہجہ میں خاصی بے باکی نظر آتی ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ذومعنی فقرے، جنس کے بارے میں تبصرے اور تاریخ کے واقعے بغیر کسی حجاب اور ہچکچاہٹ کے بیان کر دیتے ہیں۔ لیکن اس جنس نگاری میں شائستگی کو ہر صورت میں ملحوظ رکھا جاتا ہے حتیٰ کہ تاریخی واقعات کے بیان میں تو عبرت اور تنبیہہ کے پہلو کو شدت کے ساتھ ابھار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس تناظر میں "شاہین مفتی" کا یہ اعتراض کہ ان واقعات کا تلذذ سے کوئی تعلق بنتا ہے زیادہ حقیقی نظر نہیں آتا۔

"سفر در سفر" میں لہجہ کی بے باکی کے علاوہ مصنف کی دانش بھری بلیغ باتیں بھی خاصی توجہ طلب ہیں جن کے باعث سفرنامہ کے رنگ کسی بھی مقام پر مدہم نہیں ہوتے۔ ان باتوں میں دانش برہانی بھی ہے اور دانش نورانی بھی۔

منزل قریب آجانے پر مسافر ایک دوسرے سے اور ساربان سے دور ہونے لگتے ہیں۔ منزل بھی کیا محبوب ہے کہ جب قریب آجاتی ہے تو محبت کرنے والے ایک دوسرے کے رقیب بن جاتے ہیں" (ص 36)

"جب زندہ آدمی کا اندر مر جاتا ہے تو وہ بڑا خوش اخلاق اور شائستہ ہو جاتا ہے"

"نزع، فرقت اور سیکس کا کرب تقریباً ایک جیسا ہوتا ہے" (ص 74)

"سہاگ رات کے بعد عورت کو سب سے پیاری چیز مرد کا شیو کرنا لگتا ہے" (ص 70)

"عورتوں کو واقعات اور حادثات من حیث المجموع یاد رہتے ہیں۔ اور مرد کو ان کی تفصیلات یاد رہتی ہیں۔" ---(ص 104)

"روتی ہوئی عورت سے بات کرنا، اس کی بات سمجھنا اس کے لفظوں کو پہچاننا اور اس کی سوچ تک پہنچنا بڑا مشکل کام ہے" (ص ۔ 131)

"یہ جنس، محبت، معرفت، عبادت ایک ہی حقیقت کی مخصوص کروٹیں ہیں کبھی ان کے درمیان خط کھچ جاتا ہے، کبھی نہیں کھچتا۔" (ص 220)

"ماننے کے لئے جاننا ضروری نہیں" (ص 83)

"نرگس اور قمری جب اپنے اپنے معراج کو پہنچتی ہیں تو ایک ہی شے بن جاتی ہیں۔ دونوں جب تحیر میں ڈوبتے ہیں تو ان کی ہیئت کذائی ایک سی ہو جاتی ہے" (ص ۔ 239)

"نماز کی قضا ہے، خدمت کی کوئی قضا نہیں" (ص ۔ 93)

اشفاق احمد کے سفرنامے ہمہ گیریت کے حامل ہیں۔ اور ان کے اسلوب کی خوشنمائی سفرناموں کو ان کی شخصیت کی مانند مرنجاں مرنج بنا دیتی ہے۔

سعادت سعید

اشفاق احمد جدید اردو ادب کی وہ باکمال شخصیت ہیں جنہوں نے اپنے اسلوب کی سحر طرازیوں سے تجزیہ افسانہ، ڈرامہ اور سفر نامہ جیسی اصناف کو نئے فنی ذائقوں سے آشنا کیا۔ ان سے نظری اختلافات رکھنے والے بھی ان کی لسانی، فنی اور احساساتی مہارتوں کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کافکا نے اپنی محبوبہ ملینا کے نام اپنے خطوں کو لکھے ہوئے بوسوں سے تعبیر کیا ہے۔ اشفاق احمد کے افسانے لکھے ہوئے آنسو ہیں۔ یہ آنسو اس قلب گداز کا عطیہ ہیں جس نے مختلف سطحوں کی انسانی مظلومیت سے اپنی کھلم کھلا وابستگی کا اعلان کیا ہے۔ آپ اشفاق احمد کی علمی اور اصلاحی تقریروں پر نہ جایئے۔ تقریر کرتے ہوئے ان کے اعصاب کی وہی کھڑکی کھلی ہوتی ہے جس سے محتسب جھانک رہا ہوتا ہے۔ ایلی ویرا کی ایلی ویرا، برکھا کی ثریا، گڈریا کا داؤ جی، منظور ٹھیلا کا منظور ٹھیلا، لوشے پلے کی بے اولاد لڑکی، حقیقت نیوش کا جمیل، سنکہ کا سرور، گل نیریا کا بھیا اور اجلے پھول کی آپی، کیسے کیسے آشوب کیسے کیسے مصائب اور کیسی کیسی اذیتوں میں گرفتار زندگی کی سسکیوں کی علامت ہیں۔ اشفاق احمد کے آنسو محض اور محض ذاتی محرومیوں کے کیتھارسس کے لئے نہیں ہیں۔ یہ میر جگر سوختہ روتے روتے سو نہیں جاتا اور نہ ہی وہ کسی سے فریاد کرتا ہے کہ اس کی خبرلی جائے۔ نوک خار پر رقص کرنے والے یہ آنسو قارئین کے لئے خالص موتی ہیں۔ شعور کے موتی، جذبے کے موتی، مشاہدے کے موتی، تجربے کے موتی اور سب سے بڑھ کر اس روح کے موتی جس نے زندگی اور انسان کی کم مائیگوں، کیفیوں، مجبوریوں اور عظمتوں کے پیچدار اور بھول بھلیوں میں گم ہوتے راستوں میں بھی خود کو کھو دیا، کبھی پالیا۔ کھونے اور پانے، پانے اور کھونے کے درمیانی وقفوں کی تمام تر اہم تفصیلات، جزئیات، واقعات، معاملات اشفاق احمد کے افسانوں میں جس چابک دستی سے رقم ہوئے ہیں اس سے ان کے مشاہداتی حافظے، لسانی قدرت اور فنی شعور کی عظمتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ اجلے پھول کے افسانے اشفاق احمد کی انسانی حسیت کی تیزی پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہیں۔ ہر افسانہ کسی نہ کسی کے کھو جانے پر منتج ہوتا ہے۔ کرداروں سے چھنے ہوئے تڑپتے افسانہ نگار کے ہاتھ لگے۔ اردو افسانے کی دنیا میں لازوال تحریروں کا اضافہ ہوا۔ اپنے اور دوسروں کے آنسو اگر احاطہ تحریر میں آجائیں تو جان لینا چاہیے کہ معرکہ آرا اظہار کے دروا ہو گئے ہیں۔ جذبے اور کیفیات کے بھرپور اظہار ہی کو تو ادب کہا جاتا ہے۔ اجلے پھول کا ہر افسانہ کسی نہ کسی حوالے سے زندگی اور سماج کے دو پاٹن کے بیچ پسنے والے انسانوں کی کتھا کہتا ہے ہمارا یہ کبیر خود بھی روتا ہے اور دوسروں کو بھی رلاتا ہے۔ یہ اس کی اظہاریاتی خوش اسلوبی ہے کہ اس نے ان افسانوں کو نوحہ اور مرثیہ نہیں بننے دیا۔ یہ افسانے زندہ، متحرک اور زندگی کے عمل میں اپنی پوری صلاحیتوں سمیت شریک فن کار کی گواہی میں اشفاق احمد کی افسانوی مہارتیں، ان کے وسیع مطالعے، زندگی، سماج اور انسان کے حقیقی مشاہدے، فکری تجربے، تخیلاتی زاویے اور ترکیبی لسانی تجربے کا سراغ عطا کرتی ہیں۔ انہوں نے حسی، جبلی اور جذباتی حوالوں سے بھی زندگی کو پرکھا ہے اور منضبط، منظم اور استدلالی زاویہ نظر کو بھی برتنے کا اہتمام کیا ہے۔ اشفاق احمد نے "اجلے پھول" میں اپنے خیالات کی رو کو مادر پدر آزاد نہیں ہونے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں مخصوص رکھ رکھاؤ، قرینہ، سلیقہ اور ترتیب کا سماں دیدنی ہے۔ ان کا مشاہدہ تجزیاتی ہے۔ مطالعہ نکھرا ہوا، فکر پرکھا ہوا، جذبہ جاگتا ہوا، تخیل تولا ہوا اور زبان دھلی ہوئی ہے۔ حسیاتی ادراک ان کے اعصاب پر سواری نہیں کرتا۔ جبلی تقاضے ان کے شعور پر حاوی نہیں ہوتے۔ جذبہ ان کے فکر کو غلام نہیں بناتا۔ اشفاق احمد اسی خصوصی وصف کی بدولت ایک طرف تو رومانیت پسندوں سے ممیز ہیں اور دوسری طرف نئی نسل کے ان تخلیقی فن کاروں سے بھی جدا ہیں جنہوں نے اپنے اسپ تخیل کو یا تو بدست کیا ہوا ہے یا بے لگام چھوڑا ہوا ہے۔ تلقین شاہ سے لے کر اور ڈرامے تک اشفاق احمد کا رول رہا ہے۔ ایسا مفکر جس نے ادنیٰ سطح کی زندگی سے لے کر اعلیٰ سطح کی زندگی تک، علاقائی سطح کے معاملوں سے لے کر بین الاقوامی معاملوں تک، جذباتی منظرناموں سے لے کر فلسفیانہ اور مابعد الطبیعاتی منظرناموں تک ہر

شے' ہر واقعے اور ہر صورت حال کا مخصوص معیاراتی سانچوں کی مدد سے ادراک کیا ہے۔ اشفاق احمد کو ان کے ادبی' فنی اور مخصص رکھ رکھاؤ نے اشفاق احمد بنایا ہے۔ کیا وہ سیاسی اور ادبی نعروں کے سیلاب میں اپنے آپ کو بہانے کی اہلیت نہیں رکھتے؟ کیا وہ مارکسزم' وجودیت یا منطقی ثبت پسندی کے رجحانات اور رویوں سے آشنا نہیں ہیں؟ کیا وہ نقطوں کی بندوقوں میں احتجاج اور مزاحمت کے کارتوس بھرنے کے ہنر سے آگاہ نہیں ہیں؟ کیا وہ طبقاتی صورت حال کی ناہمواری پر نظر نہیں رکھتے؟ کیا وہ افسانہ نویسی اور ڈرامہ نگاری کی جدید ترین تکنیکوں سے واقف نہیں ہیں؟ سور یلزم' دادازم اور کنکریٹ ادب کے کارنامے ان کی نظر سے نہیں گزرے؟ یہ سب کچھ ان کا دیکھا بھالا ہے یہ سب کچھ ان کے سامنے ہے تو پھر انہوں نے ان فارمولوں سے اجتناب کیوں برتا ہے۔ اس قسم کے فارمولے برتنے والے آن واحد میں جدید ترین ادیبوں کی صف میں آ کھڑے ہوتے ہیں۔ شاید اشفاق احمد نہیں چاہتے کہ انہیں جدید ترین ادب کا تمغہ ملے۔ یہ تمغہ تو ہیچ فروشوں کو مبارک ہو۔ اشفاق احمد کی یہ خواہش بھی نہیں ہے کہ ان کا افسانہ گڈریا کسی روسی یونی ورسٹی کے نصاب میں شامل ہو۔ ہمارے اکثر ادیب جدید ترین ادبی تکنیکوں اور فکری تشکیلوں کے استعمال کی ایکٹنگ میں ماہر ہیں۔ اشفاق احمد کے افسانوں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ اپنی سائیکی اور اپنے وجود کے حقیقی اظہار کو فوقیت دیتے ہیں۔ اظہاریاتی ایکٹنگ سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

اجلے پھول کے افسانے انسانی بے بسی کی پر سوز روداد ہیں۔ اجلے پھول کی آپی اپنے گوہر مراد انجم کو سدا کے لئے پانے کے قریب ہوتی ہے کہ اسے اطلاع ملتی ہے کہ جرنیلی سڑک پر اس کی موٹر سائیکل اینٹوں سے بھرے ہوئے ٹرک کی لپیٹ میں آ گئی اور وہ جاں بر نہ ہو سکا۔ یہ بے بسی اتفاقی بے بسی ہے۔ گل ثریا کا کردار بھیا اس لئے بے بس ہے کہ اس کی محبوبہ مال و منال اور جاہ و جلال کی طمع میں اسے چھوڑ کر چلی گئی۔ یہ بے بسی سماجی سائیکی کا نتیجہ ہے۔ تنکا کا سرور جاگیردار کی لڑکی عطیہ کے کہنے پر انیس ہزار روپیہ جمع کرنے کے چکر میں اپنی زندگی کی ساری آزادیاں سلب کر لیتا ہے۔ عطیہ عزیزالدین سے شادی کر لیتی ہے۔ سرور ریلوے لائن کے پتھروں پر گری اٹھنی تلاش کرتے ہوئے ریلوے انجن کی زد میں آجاتا ہے یہ آزاد پنچھی گرفتار محبت انیس ہزار جمع کرنے کے چکروں میں بے بس رہا۔ دولت کے رنگیلے ریلس میں مبتلا سماج میں اس نوع کی بے بسیاں عموی ہیں۔ حقیقت نیوش کا جمیل اپنی فطری آوارگی کے ہاتھوں بے بس۔ تو تے بلے کی بچے کے لئے سویٹر بننے والی لڑکی اس لئے بے بس ہے کہ انسان کائنات کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ وہ ستاروں پر کمندیں ڈال سکتا ہے' پہاڑوں کے دل چیر دیتا ہے' آسمان اور زمین کی ہر قوت کو مسخر کر لیتا ہے لیکن جذبہ آفرینش کی رو کو اپنی مرضی کے مطابق نہیں بہا سکتا اور فطرت کے تخلیقی منصوبوں میں دخل نہیں دے سکتا۔" وہ لڑکی مزید کہتی ہے "تو تے بلے کی مجھے ضرورت تھی مادر فطرت کو نہ تھی" یہ مقدر کی بے بسی ہے۔ صفدر ٹھیلا ہیڈ ماسٹر کو مارنے کے لئے جاتا ہے لیکن اس کے بے قابو گھوڑے والی بگھی کو حادثے سے بچانے کے لئے خود موت کے منہ میں چلا جاتا ہے یہ بے بسی بہ ظاہر بدمعاش بباطن نیک کردار کے فطرتی انتخاب کی بہ دولت ہے۔ گڈریا کا داؤ جی اپنی تمام تر انسانی عظمتوں کے باوجود مختم المزاج' بد' کینہ پرور' راتو اور سیاسی احوال کی وجہ سے بے بس ہے۔ برکھا کی ثریا اپنی محبت کا اظہار نہ کر سکنے کے حوالے سے بے بس یہ بے بسی ایک سطح پر افلاطونی محبت کی بے بسی بھی ہے۔ ایل ویرا میں پروفیسر واحد متکلم اپنے Status کے ہاتھوں بے بس ہے۔ ایل ویرا اپنی طوائفیت' اپنے دل اور ایک پردیسی سے محبت کے ناتے بے بس ہے۔ مقدر' فطرت' سماج ان افسانوں کے بنیادی کرداروں کی بے بسیوں کے جرثے ہیں۔ ہمارے وہ نقاد جو فن کاروں' شاعروں اور ادیبوں سے یہ تقاضا کرتے ہیں کہ انہیں محض اور محض خوشیوں کے باغوں ہی کی عکاسی کرنی چاہئے اور زندگی کی تلخیوں' تاریکیوں' بے بسیوں' مصیبتوں' عذابوں' غموں اور کربوں کو منصہ شہود پر نہیں لانا چاہئے۔ ان کے لئے یہی کافی ہے کہ انہیں کہا جائے کہ زندگی اگر جہنم ہے تو ہمارے قلم' اس جہنم پر جنت کی تعمیر کیسے کر سکتے ہیں۔ اگر ہم خوشیوں کے باغوں کے نقشے دکھانے شروع کر دیں تو کیا ترقی پسندوں یا تصوریت پسندوں کی مانند نعرہ باز نہیں ہو جائیں گے اشفاق احمد نے زندگی کے جن پہلوؤں کا مشاہدہ کیا انہیں دیانت داری سے سپرد قلم کیا۔ وہ جانتے ہیں کہ ہر طبقے میں نیک کردار بھی ہوتے ہیں اور بدکردار بھی۔ یہ انسانی تربیت اور فطرت ہے جو انسان کو حیوان یا انسان بناتی ہے۔ نچلے طبقے کے ہر کردار کو عیوب شری سے پاک قرار دینا اور بالائی طبقے کے ہر کردار کو ابلیس صفت جاننا سیاسی منطق کا شاخسانہ تو ہے ادبی اور تخلیقی انکوائری اس کے برعکس یہ ثابت کرتی ہے کہ ہر کردار اپنی مخصوص فطرت کی بنیاد پر ہی اپنی زندگی کے وطیرے کو اپناتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جہاں برائی اور ظلم کے مواقع زیادہ ہوتے ہیں وہاں طبقاتی طور پر برے اور ظالم کرداروں کی کثرت ہوتی ہے۔ اشفاق احمد نے انسانی خیر و شر کا جائزہ لیتے ہوئے بالائی طبقے کے گناہوں کی فہرست کو زیادہ طویل ہی رکھا ہے۔

دونوں بہنیں اور دونوں بھائی چپ چاپ ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے اور ایک دوسرے کو نہ دیکھتے ہوئے بھی دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ہر ایک اچھی طرح سے سمجھ رہا تھا کہ دوسرا کیا سوچ رہا ہے۔ اور دوسرا وہی کچھ سوچ رہا تھا جو باقی کے تینوں نے ابھی سوچ کر چھوڑا تھا۔ رشیدہ نے کہا "مجھے کل ہر صورت واپس جانا ہوگا کیونکہ کرنل صاحب کے موتئے کا آپریشن ہے' اور میں جب تک ان کے پاس نہ ہوں تو وہ گھبرا جاتے ہیں اور جوش سے اور خوف سے کانپنے لگتے ہیں"۔ دونوں بھائیوں نے یک زبان ہو کر کہا "ضرور آپا۔ ضرور --- آپ کو ہر حال میں جانا چاہئے اور کرنل صاحب کی تسلی کرنی چاہئے۔"

محمود گدو بیراج سے آیا تھا اور ابھی اس کی ڈھیر ساری چھٹی باقی تھی' لیکن اس کی ڈھیر ساری چھٹی کا گھر والوں کو کوئی خاص فائدہ نہیں تھا کہ محمود بہت ہی کم گو' اور کم آمیز قسم کا انجینئر تھا۔ مسعود اسلامیہ کالج پشاور میں اکنامکس کا اسسٹنٹ پروفیسر تھا۔ اس کی چھٹی تو کم تھی لیکن وہ تار بھیج کر اور چھٹی بھی لے سکتا ہے اور فون کر کے اپنے بیوی بچوں کو بھی یہاں بلا سکتا تھا۔

میجر فرخندہ سی ایم ایچ میں گائنی کی ڈاکٹر تھیں۔ اپنے اباجی کی عاشق' اپنے اباجی کی برتری کا چلتا پھرتا اشتہار اور اپنے اباجی کا قیمتی ووٹ جب سے اباجی کے ذہن اور بدن کا رشتہ کمزور ہوا تھا وہ بھی چھٹی لے کر اباجی بختیار خاں کے پاس آ کر ان کی تیمار داری میں مصروف ہو گئی تھیں۔ جب بھی میجر فرخندہ پر طویل مایوسی کا دورہ پڑتا تو اباجی بختیار خاں ہاتھ کے اشارے سے قریب بلا کر اس کی کمر پر زور کی تھپکی دے کر اونچی آواز میں کہتے۔ "چن اپ میجر۔ چن اپ --- ایسی صورت ہم کو پسند نہیں ہے"۔ اور میجر غمناک ہو کر چن اپ کر لیتی۔

اباجی بختیار خاں نے اپنی زندگی خود بنائی تھی۔ اور بغیر نقشہ پاس کروائے بنائی تھی۔ اس میں کچھ تجاوزات بھی آ گئی تھیں جن میں کچھ تو سرکاری تھیں اور کچھ دوسرے لوگوں کی ملکیت گھر گئی تھیں۔ خاں صاحب نے کسی کی پروا کئے بغیر اپنے زور عمل سے اپنی زندگی کو بنایا تھا اور خوب بنایا تھا۔ وہ ایک معمولی آدمی سے ری رولنگ مل کے مالک بن گئے تھے اور ان کے کارخانے میں چوبیس گھنٹے کی شفٹ میں باسٹھ آدمی کام کرتے تھے۔ ایک نائب تحصیلدار کا اتنے بڑے مرتبے پر پہنچنا ان کے ذہن اور بدن کی اعلیٰ درجہ کی سنکرونائزیشن سے عمل میں آیا تھا۔ اور اس عمل میں بہت سے بے عمل لوگ ان کی پلاننگ کی بھٹی میں بھسم ہو گئے تھے۔ بختیار خاں پلاننگ کے بادشاہ تھے اور اگر وہ صنعت کاری کے میدان میں نہ اترے ہوتے تو واقعی کسی ملک کے بادشاہ ہوتے۔ اگر بادشاہ کا لفظ ممنوع الاختیار ہوتا تو بختیار خاں حکمراں ضرور ہوتے۔ ان کی ایک حکومت ہوتی۔ ایک محل ہوتا۔ نورتن ہوتے۔ سفارت خانوں کا ایک شہر ہوتا۔ ذاتی ہوائی جہاز' ہیلی کوپٹر اور ذاتی ہیلی پیڈ ہوتے اور دوسری راجدھانیوں اور راجواڑوں سے ان کے بہترین تعلقات ہوتے۔ یعنی وہ کچھ بھی کہلاتے ان کی ایک رعایا ضرور ہوتی اور وہ اپنی رعایا کو کسی بھی نام سے پکارتے رعایا ان کی حکمرانی کی تصدیق کرتی۔ وہ ایک باعمل' باہمت اور باکردار آدمی تھے۔ ان کی ساری زندگی محنت و مشقت کا ایک جیتا جاگتا نمونہ تھی اور اس کے کسی انگ پر بدمعاشی' بداخلاقی' جنسی بے راہروی یا بدمستی کا کوئی چھینٹا تک نہ تھا۔

بختیار خاں نے نیم وا آنکھوں سے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے بچوں کو دیکھا۔ پھر پتلیاں گھما کر گلوکوز کی بوتل پر نظر ڈالی اور اندر ٹیوب میں گرتے ہوئے قطروں کا نظارہ کرنے کے بعد ذرا سا مسکرا کر کہا "میری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں۔ میں اپنی تسبیح روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ ---" میجر فرخندہ نے سٹیتھوسکوپ لگا کر ان کی ہارٹ بیٹ چیک کی اور پھر اپنی کرسی پر اسی طرح جا کر بیٹھ گئی۔

بختیار خاں نے کہا "مولانا صاحب تشریف نہیں لائے؟ مولانا ظفر علی خاں صاحب!"

مسعود نے کہا "نہیں ابا جی آج تو تشریف نہیں لائے"۔

"کمال ہے" بختیار خاں نے آنکھیں بند کر کے کہا "مجھ سے خود انہوں نے فون پر فرمایا تھا کہ تمہاری مزاج پرسی کو آؤں گا اور تمہارے ساتھ چائے پیوں گا' تو اب چائے کا وقت تو ہو گیا ہے۔ کیوں رشیدہ؟"

رشیدہ نے کہا "جی ابا جی چائے کا وقت تو ہو گیا ہے"۔

"تو پھر" بختیار خاں نے ذہن پر بوجھ دیتے ہوئے کہا "یا تو انگریز نے انہیں پھر گرفتار کر لیا ہو گا۔ یا ایک آدھ دن ریسٹ کرنے کی غرض سے کرم آباد تشریف لے گئے ہوں گے"۔

"ہو سکتا ہے ابا جی وہ کرم آباد تشریف لے گئے ہوں"۔ مسعود بولا۔

لیکن آپ تھوڑی دیر آنکھیں بند کر کے خاموشی سے لیٹے رہیں ابا جی" ڈاکٹر فرخندہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "آپ کو ریسٹ کرنا چاہئے"۔

"ریسٹ بختیار خاں نے ہنس کر کہا" ریسٹ ! ہاں میری سوہنی دھی۔ ریسٹ تو میں نے ساری زندگی نہیں کیا۔ ریسٹ کو تو میں انسان کا سب سے بڑا گناہ سمجھتا ہوں ---- گناہ کبیرہ ---- اور سارے گناہ معاف ہو سکتے لیکن بے عملی اور بیکاری اور بے کار کردگی کا گناہ کبھی معاف نہیں ہو سکتا ---- جس نے سرگل' کوشش' جدوجہد' کشاکش کو چھوڑ دیا وہ انسان نہیں پتھر ہے' مٹی کا تودا ہے' ریت کا ڈھیر ہے ---- برسوں میری مہاتما بدھ سے بڑی بحث ہوئی جین مندر کے سامنے پٹڑی پر جا رہے تھے میں نے موٹر روک کر پکڑ لیا اور ہاتھ تھام کر بڑے ادب سے کہا "سر آپ نے بڑی زیادتی کی انسانیت کے ساتھ جو اس کو نرم روی' نرم دلی اور ترک خواہش کا درس دے دیا" شرمندہ سے ہو کر اپنا ہاتھ چھڑانے لگے اور مسکرا کر بولے "کیا کریں بختیار خاں' ہم کو اسی بات کا حکم تھا"۔ میں نے کہا سر آپ نے ایسا حکم کیوں مان لیا آپ کو بحث کرنی چاہئے تھی۔ آرگیومنٹ دینی چاہئے تھی کہ کوشش اور جدوجہد کے بغیر انسان کس طرح سے زندہ رہے گا۔ کس طرح آگے بڑھے گا' کس طرح نشو نما پائے گا۔ کہنے لگے "جس طرح دریا آگے بڑھتا ہے پنچھی زندہ رہتا ہے' برگد نشو و نما پاتا ہے"۔ میں نے کہا سر ایک تو آپ کو اس برگد کے پیڑ نے تباہ کر دیا جس کے نیچے جا کر آپ بے یار و مددگار بیٹھ گئے تھے اور سوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے۔ اگر آپ نے ہمت کی ہوتی اور کوشش کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا ہوتا تو کپل وستو جیسی آپ کی کئی راجدھانیاں ہوتیں اور اس وقت دنیا کی تاریخ میں آپ کا نام زندہ ہوتا لیکن آپ نے رہبانیت کی تعلیم دے کر اور ترک خواہش کا سبق سکھا کر لوگوں کو بھی بے عمل کیا اور خود بھی تنہائی اور گمنامی کی زندگی بسر کر کے اس جہاں سے چلے گئے۔ کوئی آپ کو جانتا ہی نہیں"۔

ڈاکٹر فرخندہ نے کہا "ابا جی آپ سونے کی کوشش کریں۔ میں کھڑکیوں کے پردے کھینچے دیتی ہوں"۔

"پرانی سی بات ہے بیٹا" بختیار خاں نے ہاتھ اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "جو سوتے ہیں وہ کھوتے ہیں' جو جاگتے ہیں وہ پاتے ہیں' میں سونا نہیں چاہتا۔ جاگنا چاہتا ہوں' مجھے مرنے سے نفرت ہے اور مدہوشی سے بیر ہے۔ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں اور زندہ ہی رہوں گا انشاء اللہ ---- میں امر ہوں' کیونکہ میں کوشش ہوں' محنت ہوں' جدوجہد ہوں۔" پھر انہوں نے چونک کر پوچھا "راجہ صاحب کا فون تو نہیں آیا تھا؟"

"کونسے راجہ صاحب ابا جی" پروفیسر مسعود نے پوچھا۔

"اپنے راجہ غضنفر علی خاں صاحب ------- مجھ سے والٹن ایئر پورٹ پر ملے تھے لیکن وہ بھی جلدی میں تھے اور میں بھی تیزی میں تھا۔ ہاتھ ہلا کر فرمانے لگے "میں آپ کو فون کروں گا خاں صاحب پتہ نہیں کیا وجہ ہے انہوں نے فون نہیں کیا' ویسے تم لوگ بھی اپنی اپنی غرض کے بندے ہو۔ شاید تم نے فون ریسیو ہی نہ کیا ہو ------- ویسے میں نے مہاتما بدھ کو آج لاجواب کر دیا۔ شرمندہ سے اور کھسیانے سے کھڑے تھے اور ان سے کوئی جواب نہ بن پڑتا تھا۔ میں نے ان کا کندھا ہلا کر کہا سر! کوشش اور سعی مسلسل کے بغیر معاشرے میں زندگی کے آثار باقی نہیں رہتے۔ مقابلے کی فضا میں ہی قومیں آگے بڑھتی ہیں اور مقابلہ کر کے ہی انسان حیات ارضی میں آفتاب عالمتاب بن کر دمکتا ہے ----- انہوں نے مسکرا کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بڑی ملائمت سے کہا "خاں صاحب! انسان مقابلے کی دنیا میں انسان کے خلاف ہی نبرد آزما ہوتا ہے۔ دیوار' پتھر' کھمبے' جنگلے اور درخت سے مقابلہ نہیں کرتا۔ تمیں چالیس انسانوں کو جب ایک کامیاب انسان پسپا کر کے' پیچھے دھکیل کے اور زمین پر گرا کر آگے بڑھتا ہے تو پھر زمین پر گرے ہوئے ان تمیں چالیس ذلتوں کے ماروں کا ہم کیا کریں۔ ان کا گھر کدھر سے بھریں۔ ان کی سہائتا کیسے کریں۔ ان کو زندہ کس طرح سے کریں۔ وہ بھی تو انسان ہیں' وہ بھی تو اس معاشرے کا ایک حصہ ہیں' ان کو بھی تو زندہ رہنے کا حق ہے۔" میں نے کہا سر! میں تو آپ کو بڑا ودوان اور بدھی وان سمجھتا تھا لیکن آپ نے یہ کیا کچی بات کر دی۔ آپ سے تو ہٹلر اور ہلاکو زیادہ صاحب عمل تھے۔ انہوں نے ساری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ اور آپ کی رہبانیت کے تصور کی جڑیں اکھاڑ کر رکھ دیں۔

ملکوں کی نئی سرحدیں قائم کیں اور شہروں کے اندر دیواریں کھنچوا دیں آپ برگد کے درخت تلے آنکھیں بند کر کے بیٹھے رہے۔ کیا مل گیا اس سے دنیا کو اور آنے والی نسلوں کو ------ مہاتما بدھ میری باتیں سن کر شرمندہ سے ہو گئے اور میرا کندھا تھپتھپا کر بولے "آپ کے لئے آپ کا دھرم اور ہمارے لئے ہمارا" اس میں جھگڑے کی کیا بات ہے۔ اب مجھے اجازت دیجئے۔ پھر ملاقات ہوگی تو اور باتیں ہوں گی اس وقت مجھے ایک مریض کو دیکھنے جانا ہے۔" ڈاکٹر ارشد نہیں آئے آج؟" "آئے تھے ابا جی" رشیدہ نے کہا "صبح آپ کو ٹیکہ دے کر گئے تھے اور شام کو پھر آئیں گے شاید۔"

"مہاتما بدھ جاتے جاتے کہنے لگے "خان صاحب! مقابلہ بازی گھوڑوں پر تو بجتی ہے انسانوں پر نہیں یہ کہہ کر بختیار خاں طنزیہ ہنسی ہنسے اور گلوکوز کی ڈرپ دیکھنے لگے۔

تھوڑی دیر تک کمرے میں خاموشی رہی۔ پھر بختیار خان نے آنکھیں کھول کر سب کو باری باری دیکھا اور دھیمی آواز میں کہنے لگے "پچھلے ہفتے وہ بڈھا فرانسیسی مجھے ٹی پی او کی سیڑھیوں پر مل گیا۔ اس کی چوخانہ گول ٹوپی نے اس کا بایاں کان بالکل چھپا رکھا تھا اور وہ اپنی پائپ میں پھونکیں مارتا ہوا سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ میں نے راستہ روک کر کہا "اوے آندرے ژید یہ تم نے کیا بکواس کی کہ بڑے انسانوں کے عظیم کارناموں میں عقل کے مقابلے میں قسمت زیادہ کار فرما رہی ہے۔" اس نے اپنے کندھے سکوڑ کر کہا "پاردوں موسیو مجھے اردو نہیں آتی سوری۔" اور کنی کاٹ کر تیزی سے دوسری طرف نکل گیا ------ اچھا! آج صبح جے پرکاش نرائن تو نہیں آئے تھے؟"

"نہیں ابا جی" میجر فرخندہ نے جواب دیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

کم گو محمود نے بڑی آہستگی سے کہا "میں بہت تھک گیا ہوں ذرا کمر سیدھی کر کے واپس آتا ہوں۔"

"اوے محمود" بختیار خاں نے ماتھے پر تیوری ڈال کر کہا تیرے جیسے لوگ جو ریشمی نائٹ سوٹ پہن کر سوتے ہیں وہ صبح مشکل ہی سے اٹھ سکتے ہیں۔ اور جو صبح سویرے مشکل سے اٹھتے ہیں وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتے۔ جا دفع ہو جا۔"

محمود جو اپنی کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ دوسرے کمرے میں دفع ہو گیا اور بختیار خاں نے اپنی آنکھیں پھر بند کر لیں۔ رشیدہ نے میجر فرخندہ سے کہا "مجھے اپنا سامان پیک کرنا ہے' اسی لئے تھوڑی دیر کے لئے میں بھی اجازت چاہوں گی۔"

بختیار خاں نے آنکھیں کھولے بغیر انگلی اٹھا کر کہا "خبردار ------! کوئی ضرورت نہیں سامان پیک کرنے کی۔ آرام سے بیٹھو۔"

رشیدہ جو اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی چپ چاپ پھر بیٹھ گئی۔

مسعود نے کہا "آپ جوس لیں گے ابا جی ------ ایپل جوس"

نو تھینک یو۔ مہربانی" بختیار خاں نے ہولے سے کہا "میں کوئی بیمار ہوں جو ایپل جوس پیتا پھروں ------ شکریہ"

میجر فرخندہ اپنی جگہ سے اٹھی اور گریہ پائی کے ساتھ ڈرپ سٹینڈ کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ تھوڑی دیر تک تو اس نے گلوکوز کی الٹی لٹکی ہوئی بوتل کو دیکھا پھر قطروں کی ٹپکاٹ کو ذرا سا اور تیز کر دیا۔ بختیار خان نے ایک جھرجھری لے کر ریس کے گھوڑے کی طرح ناک کے نتھنے پھلائے اور پھر کہنے لگے "آج دوپہر میں نے ریڈیو سٹیشن فون کیا تھا لیکن مجھے وہ خبیث ملا نہیں۔ سٹیشن ڈائریکٹر کہنے لگا وہ ہر روز یہاں نہیں آتے ہفتے میں ایک بار آتے ہیں۔ میں نے جھڑک کر کہا اوئے تم سٹیشن ڈائریکٹر ہو کر اس کا پروگرام بند نہیں کر سکتے تو وہ گھگھیا کر کہنے لگا کہ ہماری تو بہت کوشش ہے سر لیکن ہمارے لسنر اسے بہت پسند کرتے ہیں۔ میں نے کہا لعنت ہو تم پر اور تمہارے لسنروں پر۔"

پھر تھوڑی دیر رک کر بختیار خاں بولے "بڑا اندھیر ہے ڈاکٹر فرخندہ یہ بدبخت ہمارے نوجوانوں کو ترقی کرنے سے روک رہا ہے کمپٹیشن سے نکال رہا ہے۔ دولت کے حصول سے منع کر رہا ہے۔ نوجوانوں کا اخلاق تباہ کر رہا ہے اور ہر ہفتے ریڈیو سے بکواس کر کے چلا جاتا ہے۔ ہم کہتے ہیں میرٹ پر آنے والوں کو زندہ رہنے کا حق دو۔ انہوں نے محنت کی ہے۔ مشقت جھیلی ہے۔ بے میرٹ کے لوگوں کو اس معاشرے سے نکال دو۔ اس ملک سے دفع کرو وہ ہمارے ملک کا بوجھ اور ہمارے معاشرے کا ناسور ہیں۔ کامیاب لوگ ہمارے وطن کی زینت اور معاشرے کا حسن ہیں۔ کامیابی ایسا خمیرہ مروارید ہے پروفیسر مسعود' جس سے معاشرے کے ڈوبتے ہوئے دل کو تقویت ملتی ہے۔"

"ابا جی آپ سو جائیں۔"

"سو نہ سکیں تو تھوڑی دیر کے لئے چپ ہو جائیں۔"

چپ نہ رہ سکیں تو کوئی ذکر شروع کر دیں۔"

بختیار خاں نے اپنے بچوں کی باتیں سنی ان سنی کر کے کہا "پرسوں خانساماں کچن میں اس بدبخت کا پروگرام اونچی آواز میں لگا کر سن رہا تھا اور

وہ اپنے مخصوص لہجے میں بکواس کر رہا تھا کہ کامیابی اور ناکامی دونوں کو ہی برداشت کرنا ایک مشکل کام ہے۔ کامیابی کے ساتھ نشہ آتا ہے۔ شراب' ڈرگ' نارکوٹکس' پھر طلاق آتی ہے۔ اس کے ..... بعد دوسری شادی بلکہ شادیاں ..... بدمعاشیاں ..... داداگیریاں ..... تو سر بازیاں لمبے لمبے سفر شروع ہو جاتے ہیں۔ گھٹنے گھٹنے بعد دواؤں کا ورد ہونے لگتا ہے جسمانی' روحانی' نفسیاتی عارضے بڑھ جاتے ہیں۔ مایوسی کے بادل چھانے لگتے ہیں ..... اور آخر میں خودکشی آجاتی ہے ..... یہ ہیں کامیابی کی برکتیں اور ناکامی میں صرف ناکامی ہی ہاتھ آتی ہے ------ میں نے خانساماں سے چیخ کر کہا بند کرو اس کتے کی بکواس کو جو لوگوں کو دنیا سے الگ رہبانیت کا اور گوشہ نشینی کا درس دے رہا ہے۔"

رشیدہ نے دبی زبان میں کہا "اباجی' خانساماں آپ کے رویہ کی شکایت کر رہا تھا۔"

"کرے شکایت' شوق سے کرے۔" اباجی نے نفرت سے ناک سکوڑ کر کہا "مجھے کیا پرواہ ہے اس کی' میں اس کا نوکر ہوں غلام ہوں؟ ایمپلائی ہوں؟ کوئی دبتا ہوں اس سے؟ کرے شکایت' کھل کے کرے۔ اس کی شکایت سے ڈر کر میں حق اور سچ کہنا نہیں چھوڑوں گا ٹرتھ کے اعلان سے منہ نہیں موڑوں گا ------ اب تم لوگ خود ہی فیصلہ کرو کہ جب میں کامیاب ہوا اس زندگی میں اور ایک نام پیدا کیا شہرت حاصل کی دولت کمائی' کارخانے لگائے تو کیا میں نے تمہاری ماں کو چھوڑ دیا؟ کوئی نئی شادی کی' کوئی بدمعاشی' کوئی نشہ' کوئی گھمنڈ کوئی طاقت کا ناجائز استعمال کیا؟ بتاؤ کیا؟ ------ حالانکہ میں سب کچھ کر سکتا تھا' سب کچھ کروا سکتا تھا۔ اپنی ہر بات منوا سکتا تھا۔ لیکن میں نے نہیں کیا کچھ' نہیں منوایا کچھ۔ نہیں تقاضا کیا کوئی ------ میں کوئی لمبے سفروں پر نہیں گیا ماسوائے اپنے ماہانہ بزنس ٹورز پر۔ میں نے کوئی گولیاں کھانا شروع نہیں کیں' ماسوائے اپنی روزمرہ وٹامن کے' آئرن ڈوز کے۔ سوڈنگ پاؤڈر کے۔ نیند کی گولی کے' اور اجابت صحیح کے لئے منزل آئل کے ایک چمچے کے۔" پھر انہوں نے سر تکیے سے ذرا اوپر اٹھا کر کہا "اوے میں کبھی بیمار ہوا اپنی زندگی میں۔ آج تک۔ اس وقت تک۔ کوئی ذہنی کوئی جسمانی عارضہ ..... کوئی فزیکل ڈیلی ..... کسی قسم کی ..... بولتے کیوں نہیں۔ جواب کیوں نہیں دیتے؟ سانپ کیوں سونگھ گیا۔ بکواس کیوں نہیں کرتے ..... بولو ..... بولو ..... بولو ..... میری بات کا جواب دو ..... بات کا جواب دو۔"

بختیار صاحب اس قدر اونچی آواز میں بولنے کے بعد بیہوش ہو گئے اور ان کے سرہانے مانیٹر کی بیپ تیز ہو گئی۔ ڈاکٹر فرخندہ نے جلدی سے ایک ٹیکہ ڈرپ کی نالی کو دیا اور پھر سارے اٹھ کر اباجی بختیار خاں کے کمرے سے ڈرائینگ روم میں چلے گئے۔

ڈرائینگ روم میں دو بہنیں اور مسعود بھائی ایک ہی صوفے پر بیٹھے تھے اور ایک دوسرے کو نہ دیکھتے ہوئے بھی دیکھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں خانساماں یخنی کی پیالی اور تحریری استعفیٰ لے کر آگیا۔ یخنی کی پیالی اس نے آپا رشیدہ کو دی اور استعفیٰ پروفیسر مسعود صاحب کے سامنے تپائی پر پھیلا دیا۔ میجر فرخندہ نے کاغذ پر نگاہیں ڈالے بغیر چن اپ کر کے سردار سے کہا "دیکھو سردار تم اباجی کی طبیعت کو تو شروع ہی سے جانتے ہو اور ہم سے بہتر جانتے ہو' پھر تم یہ عرضیاں لکھ لکھ کر کیوں لاتے ہو؟"

سردار نے تقریباً روتے ہوئے کہا "اب میرا یہاں رہنا بہت مشکل ہو گیا ہے آپا جی۔ صاحب ہر وقت مجھے گالیاں دیتے رہتے ہیں اور میری ماں بہن پنتے رہتے ہیں۔ میں بھی آخر عزت دار آدمی ہوں۔ بال بچوں والا ہوں۔ میں کب تک یہ سب کچھ برداشت کرتا رہوں آپ مجھے آزاد کر دیں صاحب جی اور میری دعا لیں۔"

پروفیسر مسعود نے جھوٹ موٹ جھڑک کر کہا "اوے بکواس نہ کر احسان الٰہی جب ہم سارے یہ سب برداشت کر رہے ہیں تو تو کیوں نہیں کر سکتا؟ آخر ہم ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ پلے بڑھے ہیں۔ ایک دوسرے کے دکھ سکھ کو سمجھتے ہیں۔ ایک دوسرے کے بھیدی ہیں پھر یہ استعفیٰ کس لئے؟"

مسعود نے خانساماں کا استعفیٰ پھاڑ دیا اور اس کے پرزے خانساماں ہی کے ہاتھ میں دے دیئے۔

میجر فرخندہ نے کہا "اس مہینے سے تم کو پچاس روپے ماہوار زیادہ ملا کریں گے کیونکہ تم ایک بیمار آدمی کی دیکھ بھال کر رہے ہو اور تمہاری ذمہ داری بڑھ گئی ہے"

خانساماں خوشی سے پھولا نہیں سمایا اور مسکراتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

آپا رشیدہ واپس کراچی چلی گئی تھیں کیونکہ کرنل صاحب کے موتئے کا آپریشن ضروری تھا۔ انجینئر محمود تھے تو سہی لیکن نہ ہونے کے برابر۔ اباجی بختیار خاں کی تیمارداری کا سارا بوجھ میجر فرخندہ اور پروفیسر مسعود پر تھا۔ حاضری تینوں ہی دیتے تھے لیکن محمود صاحب کی نہ تو کوئی رائے تھی اور نہ ہی وہ کوئی تجویز پیش کرتے تھے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ اباجی

کے بارے میں فکر مند نہیں تھے۔ وہ کافی پریشان تھے لیکن ان کے پاس اظہار کی کمی تھی۔

آج ابا جی جسمانی طور پر پہلے سے بہتر نظر آتے تھے لیکن ان کی سوچ اسی مقام پر اٹکی ہوئی تھی۔ آواز ذرا دھیمی ہو گئی تھی لیکن جوش و خروش ویسا ہی تھا۔ انہوں نے تکئے سے اپنا سر اٹھانے کی کوشش کی اور ساتھ ہی مسکرانے کو بھی زور لگایا مگر دونوں ہی کام نہ ہو سکے۔ اپنے بچوں کو سامنے بٹھا کر دیکھنے لگے "مجھے افسوس ہے کہ کل شام میں تمہیں لی فنگ چو نہ لے جا سکا۔ دفتر سے میں نے تم کو بہتیرے فون کئے مگر تم میں سے کوئی بھی گھر پر موجود نہ تھا اس لئے میں اکیلا ہی چینی ریستوران چلا گیا۔ یہ رشیدہ کدھر ہے؟"

"آپا کراچی چلی گئی ہیں ابا جی" میجر فرخندہ نے کہا "عادل بھائی کا آپریشن ہے۔"

"عادل کا آپریشن" بختیار خاں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا "اس کو کس آپریشن کی ضرورت آپڑی"؟

"موتئے کا آپریشن ہے ابا جی" مسعود نے تسلی آمیز لہجے میں کہا "اب وہ لیزر سے یہ آپریشن کرتے ہیں۔ زیادہ دقت نہیں ہوتی"

"اچھا" بختیار خاں آنکھیں بند کر کے بولے "انسان اگر اصولوں پر کوئی سمجھوتہ نہ کرے تو اس کو کسی قسم کی دقت نہیں ہوتی مجھے بھی چائنیز مینو دیکھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی میں مینو دیکھے بغیر نمبروں کے حساب سے آرڈر دیتا ہوں اور مجھے تقریباً سارے آئیٹم زبانی یاد ہیں لیکن کل رات میں نے بیرے کو ابھی آرڈر نہیں دیا تھا کہ مجھے کونے میں ایک ہیولا سا نظر آیا جو ہاتھ ہلا ہلا کر مجھے اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا۔ میں نے دیکھا ضرور لیکن کچھ سمجھا نہیں۔ تھوڑی دیر بعد بیرے نے آکر مجھے کہا "وہ صاحب آپ کو بلا رہے ہیں" میں آہستگی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور ان صاحب کی طرف چل دیا۔ اور میری حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی فرخندہ جب میں نے ایک مدت کے بعد سکندر کو دیکھا۔ وہ ویسا ہی ہشاش بشاش اور نور نور تھا۔ اس کے ساتھ اس کے دو مہمان تھے جو مجھے دیکھ کر اپنی نشستوں سے اٹھ کر کھڑے ہوئے اور دونوں نے اپنے ہاتھ میری طرف پھیلا دیئے ------ تم تو سکندر کو اچھی طرح سے جانتے ہو مسعود؟"

"جی ابا جی کیوں نہیں" مسعود نے دماغ پر زور دیتے ہوئے کہا "لیکن اس وقت میرے ذہن میں ان کی شکل کچھ ٹھیک سے نہیں آرہی۔" "حد ہو گئی مسعود...." بختیار خاں نے چڑ کر کہا "بھئی سکندر اعظم' مقدونیہ کے شہنشاہ فلپس کا بیٹا' فاتح اعظم"!

فرخندہ نے کہا "ابا جی آپ باتیں نہ کریں ڈاکٹر صاحب منع کر گئے ہیں۔"

ابا جی نے فرخندہ کی بات پر توجہ دیئے بغیر کہا "اس کے ساتھ چوڑے رخ کی ٹوپی لگائے نپولین بونا پارٹ تھا اور ساتھ مجھے سرہاوڑے تنگ تھا جس نے بند گلے کی موٹی شرٹ اور اسی کپڑے کی پتلون پہن رکھی تھی۔ میں نے ہاتھ اونچا کر کے کہا "عمل و حرکت اور فعل و اقدام کے پاسبانو میرا سلام قبول کرو اور میرے مقدر کے ستارے پر نگاہ ڈالو کہ میں کرہ ارض کے عظیم ترین راہنماؤں کی محفل میں ان کے ساتھ بیٹھا ہوں۔" انہوں نے ہلکی سی مسکراہٹ سے میرا سلام قبول کیا لیکن منہ سے کوئی جواب نہ دیا۔

فرخندہ نے کہا "ابا جی آپ نے اپنا گرین کیپ سول لے لیا؟"

ابا جی نے کہا "جب بیرا مینو لے کر آیا تو میں نے کہا آج آپ تینوں میرے مہمان ہیں اور میں نہایت ادب کے ساتھ شرف میزبانی کے حصول کی درخواست کرتا ہوں۔ سکندر نے اور ماؤزے نے اثبات میں سر ہلایا لیکن بونا پارٹ کہنے لگا۔ میں معذرت چاہتا ہوں خان صاحب آج میری طبیعت ذرا بوجھل ہے اس لئے میں کھانا نہیں کھاؤں گا البتہ آپ کے ساتھ بیٹھوں گا ضرور۔ میں نے کہا "آپ صرف لائٹ قسم کا سوپ لے لیجئے چکن بروتھ یا تھائی سوپ" نپولین نے کہا "میں محفلوں اور ضیافتوں میں کبھی بھی کھانا نہیں کھاتا۔ کیونکہ میں اپنا دایاں ہاتھ ہمیشہ اپنی واسکٹ کے اندر رکھتا ہوں۔ یہ دیکھئے' اس نے اپنا پیٹ ہلا کر کہا میں اپنی ہر واسکٹ کے درمیانی دو بٹنوں کا فاصلہ زیادہ رکھواتا ہوں تاکہ میرا ہاتھ آسانی سے اندر داخل ہو سکے آپ کا بہت بہت شکریہ آپ ماحضر تناول کریں میں آپ کو کمپنی دوں گا۔" جب ماؤ بیرے کو آرڈر لکھوا چکے تو میں نے سکندر اعظم سے کہا۔ یہ علاقہ تو آپ کا دیکھا بھالا ہے اور آپ اسے فتح کر چکے ہیں اس لئے آپ کو تو کوئی دقت نہیں ہوگی..... اس نے مسکرا کر کہا "آپ کا یہ علاقہ تو میں نے فتح نہیں کیا تھا البتہ اس کے سارے بالائی حصے میرے زیر نگیں تھے۔ میں نے سیلوکس کو ایک بلو پرنٹ بنا کر دیا تھا کہ اگلی مرتبہ جب میں آؤں گا تو یہ سارا علاقہ فتح کر کے اپنی قلمرو میں داخل کروں گا لیکن واپسی پر ساہیوال کے کچھ جانگلیوں سے ہماری مڈ بھیڑ ہو گئی۔ ان لوگوں کے پاس باقاعدہ تو کوئی ہتھیار تھے نہیں۔ ڈانگوں کے ساتھ سن کی رسیوں سے چھریاں باندھ کر بلیں سی بنا کر آگئے تھے۔ اس وقت گو میری سپاہ تھک چکی تھی پھر بھی ہم ان جانگلیوں سے سینہ سپر ہو کر لڑے اور کشتوں کے پشتے لگا دیئے۔ میں نے کہا

سکندر صاحب اتنی چھوٹی سی عمر میں اتنی کم فوج کے ساتھ آدھی دنیا کو فتح کر لینا صرف آپ کے جوشِ عمل کی وجہ سے ہوا ورنہ یہاں تو کالے پہاڑ ایسے ہاتھیوں کی لاتعداد فوجیں تھیں۔ سکندر نے کہا "بس جی کیا عرض کریں خان صاحب یہ سب مقدر کی باتیں ہیں۔ ایک جانگلی کی برچھی میرے کندھے میں گئی اور دو تین انگل اندر اتر گئی۔ میں نے گھوڑا چڑھا کر اس جانگلی کا تو خاتمہ کر دیا البتہ اس زنگ آلود برچھی سے مجھے سیپٹک ہو گیا اور تیز بخار نے میرا دماغ شل کر دیا۔ پھر میں آپ کے علاقے پر دوسرا حملہ کرنے کی حسرت دل ہی میں لے گیا۔" نپولین نے کہا "یہ سب قسمت کے کھیل ہیں اور جو کچھ ہونی کرتی ہے وہ ہو کے رہتا ہے۔ میں نے سارے یورپ کے چھکے چھڑا دیئے۔ مصر کے ابوالہول میرے دبدبے کے آگے اپنی ٹوٹی ناک رگڑنے لگے لیکن ہوا وہی جو تقدیر میں لکھا تھا۔ اپنی ساری تیاری، کوشش ہمت اور پلاننگ کے باوصف میں روس میں پھنس کے رہ گیا۔ وہاں سے واپسی بڑی ذلت کی واپسی تھی۔ پھر واٹرلو کے مقام پر رو گلے کے نیلسن نے میری ہیرے جیسی فوج کی آن بان کو مٹی میں ملا دیا" ------- ماؤ نے کہا "کسی ملک پر فوج کشی کرنا اور قلعوں اور محلوں کے محاصرے کر کے جنگجو محافظوں سے ہتھیار ڈلوانا، اپنی دھرتی سے مگ طیارے اڑا کر دشمن پر بمباری کرنا اور اپنے گھر کے صحن سے راکٹ لانچ کرنا بڑا ہی آسان کام ہے لیکن ذلتوں اور پستیوں میں ڈوبی ہوئی اپنی قوم میں انقلاب لانا مشکل ہی نہیں ناممکن بات ہے۔ میں نے گراں خواب چینیوں کو ان کی صدیوں کی نیند سے بیدار کر کے ایک زندہ قوم میں تبدیل کر دیا۔ ان کو لانگ مارچ کی سوئی کے ناکے سے گزار کر ایک سپرپاور بنا دیا ----- لیکن شاید اس کی ضرورت نہیں تھی۔" "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں کامریڈ" میں نے چلا کر کہا اور کھانا کھاتے ہوئے لوگ مڑ کر ہماری طرف دیکھنے لگے۔ "میں ٹھیک کہہ رہا ہوں بختیار خاں" ماؤ نے بڑے تحمل سے جواب دیا "لوگ انقلاب کا ذکر بڑے شوق سے کرتے ہیں لیکن جب وہ آجائے تو اسے پسند نہیں کرتے" ------ سکندر اعظم نے ڈرم سٹک کی بوٹی منہ سے نکال کر کہا کیسی باتیں کرتے ہو یار، تمہاری قوم تو تمہیں پوجتی ہے۔ اگر وہ تمہیں ایک دیوتا نہیں سمجھتی تو ایک پیغمبر ضرور خیال کرتی ہے۔" نپولین نے کہا "ہم بادشاہ لوگ اور فاتح لوگ تو ہمیشہ نفرت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں لیکن انقلابی لیڈر تو لوگوں کے دلوں میں محبت اور مروت کے جھنڈے گاڑ دیتے ہیں، وہ تو امر ہو جاتے ہیں" ----- میں نے بوناپارٹ سے کہا "آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں نپولین! ماوزے تنگ صاحب کی تو چین میں پرستش ہوتی ہے۔ لوگ ان کے جذبۂ حب الوطنی اور خلوص و ایثار کو اب تک یاد کرتے ہیں اور جو جو قربانیاں انہوں نے چین کو آزاد کرانے میں دی ہیں اور جس ہمت اور جوانمردی کے ساتھ انہوں نے امریکا کی مکروہ سیاست اور ثقافت کو اپنی سرزمین سے دور رکھا ہے یہ انہیں کا حصہ ہے" ------- سکندر اعظم نے کانٹا روک کر پوچھا "کیا ٹرم تم نے چلائی تھی ماؤ امریکا کے بارے میں؟" "میں انہیں پیپر ٹائیگر کہتا تھا" ماؤ نے کہا "اور یہ اس وجہ سے کہتا تھا کہ میرے لوگوں کے دل سے امریکا کی بڑائی اس کی امارت اور اس کی جارحانہ صلاحیت کا خوف دور ہو جائے اور وہ کم از کم پوری ایک صدی تک امریکا کو چین کی سرزمین سے دور رکھ کر اپنی مرضی کے مطابق ملک چلا سکیں۔" "اور اسی طرح سے ہو رہا ہے" میں نے کہا "جب کوئی عمل نیک نیتی سے اور خلوص سے اور لگن سے کیا جاتا ہے تو اس کا یہی نتیجہ نکلتا ہے جو اس وقت چین میں روز روشن کی طرح نظر آرہا ہے۔ ہم پاکستانیوں کو تو چین کی دوستی اور چین کے عمل اور چین کی راست روی پر فخر ہے۔" "لیکن میرا تجربہ یہ کہتا ہے خاں صاحب۔" نپولین نے واسکٹ سے ہاتھ نکالے بغیر کہا کہ "چین میں جو کچھ ماؤ نے کیا اور چین کو جس طرح ماؤ لے کر چلا اور چین جس انداز سے لال کتاب کی حدت میں تپ کر فولاد بنا وہ اپنی اس منزل سے واپس بھی لوٹ سکتا ہے جس طرح روس سے میری مراجعت ہوئی تھی۔" "یہ تو خیر نہیں ہو سکتا۔" ماؤ نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں بند کر کے جواب دیا۔ "یہ البتہ ہو سکتا ہے کہ ساٹھ ستر سال گزرنے کے بعد لوگ بور ہو کر اپنے عمل پر نظر ثانی شروع کر دیں اور میری تعلیمات میں بدعتیں تلاش کر کے الگ سے ایک ٹولہ بنا لیں ------ لیکن ابھی اس میں بہت دیر لگے گی۔" "آپ نے کام ہی ایسا پکا کیا ہے کہ اب اس کی چولیں کبھی بھی ڈھیلی نہ ہو سکیں گی میں نے انہیں یقین دلایا کہ اب ان کی تعلیمات کا اثر ایشیا سے نکل کر دوسرے ملکوں میں پھیل رہا ہے۔ کیوں ٹھیک کہا ناں میں نے؟"

"جی ابا جی" مسعود نے ہولے سے کہا اور اپنی گھڑی میں اگلی خوراک کا وقت دیکھنے لگا۔

ابا جی تھوڑی دیر تک تو آنکھیں بند کئے لیٹے رہے، اچانک ایک بار پھر ان کا ٹل کھل گیا کہنے لگے "یہ بوناپارٹ بھی عجیب مسخرا آدمی ہے۔ آدھ پون گھنٹہ ہماری باتیں سننے کے بعد بولا "بھائی صاحب میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انسان کے بنائے ہوئے اصول اور ضابطے، پلان اور منصوبے فلسفے اور بند شیں انسان کے دکھوں کا علاج نہیں کر سکتے انسانوں کے لئے تو کچھ

اوپر سے ہی بن کر آنا چاہئے۔ کوئی زائچہ' کوئی صحیفہ' کوئی پلان' انسانی تجویزیں تو بڑھے تیل کی طرح جلد ہی گودا ٹپک جاتی ہیں" ------- مجھے نپولین کی یہ بات سن کر رونا آگیا اور میرا دل درد کی شدت سے پھٹنے لگا۔ میں نے چیخ کر کہا "فاتح پروشیا! یہ تم کیا رجعت پسندوں کی سی باتیں کرنے لگے ہو۔ انسانوں کے مسائل انسان ہی حل کر سکتے ہیں اور انسانوں کے دکھ درد کا علاج انسان ہی کے ہاتھ میں ہے۔ کوئی آسمانی قوت یا آفاقی طاقت زمین کے انسانوں کی مدد نہیں کر سکتی۔ انسان صرف اپنی محنت سے' اپنے زور عمل سے' سرگرمی اور جانفشانی سے' مشقت اور دوڑ دھوپ سے اپنی راہوں پر چراغاں کر سکتا ہے' اور اپنی زندگی میں آسانیاں پیدا کر سکتا ہے۔" "میری بھی یہی سوچ تھی" ماؤ نے کہا "لیکن اب مجھے انسانی کوشش اور انسانی تجویز بالکل بے معنی دکھائی دیتی ہے۔ اپنی تجویز کی کوشش' محنت اور جدوجہد کا نتیجہ اکثر کٹی کاٹ جاتا ہے۔ اور مجھے اس فیکٹری کی تلاش ہے جو نتیجے کی کٹی کٹوا دیتا ہے۔" میں نے ماؤ کا یہ فقرہ سن کر چھری کانٹا ہاتھ سے رکھ دیا' اور میری آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا۔ سکندر اعظم نے پریشان ہو کر پوچھا کیا بات ہے بختیار خاں تم رو کیوں رہے ہو۔ کیا کہا ان لوگوں نے تم سے؟" میں نے سکندر کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور بھوکے بھیڑیے کی طرح ماؤ اور بونا پارٹ پر لپکا کہ کوشش' محنت' مشقت اور جدوجہد چھوڑ کر انسان ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جائے۔ غاروں میں چلا جائے جنگلوں میں نکل جائے' رہبانیت اختیار کر لے' جامد ہو جائے' پتھر بن جائے اور ترقی نہ کرے' آگے نہ بڑھے' روشنی نہ پھیلائے۔

بونا پارٹ نے کہا "جب میں نے مصر فتح کیا تو مجھے وہاں کے لوگوں سے پتہ چلا کہ انسانوں کے لئے اوپر سے دو کام ہی تجویز ہوتے ہیں امر کے مطابق کرتا جائے اور مناہی کو چھوڑتا جائے۔"

"اور ترقی نہ کرے آگے نہ بڑھے۔ کوشش نہ کرے۔"

نپولین نے کہا "ترقی تو پیچھے سے خود بخود چلی آرہی ہے اپنی عادت اور سنت کے مطابق' زور دار ہوا کی طرح۔ ہمیں تو صرف اوامر اور نواہی کی ڈور کو تھام کے رکھنے کا حکم ہے' پتنگ تو خود بخود اوپر چڑھتی جائے گی ہوا کے زور پر۔ ہم تینوں سے یہ غلطی ہوئی کہ ڈور کا تو کوئی دھیان نہیں کیا اور پتنگ کو اوپر اٹھانے اور پھدک پھدک کر اوپر چڑھانے کی کوشش کرتے رہے۔"

سکندر اعظم نے کہا "یہ کیا چیز ہوتی ہے جس کا تم نے ابھی نام لیا اور جس کی ڈور تھام کر رکھنے کا حکم ہے؟"

بونا پارٹ نے کہا "یہ ڈوز اور ڈونٹس کا ایک مینوئیل ہے جو مصر والوں کے پاس تھا۔"

"پھر تم نے لیا کیوں نہ ان سے یہ مینوئیل؟" سکندر نے پوچھا۔

"وہ عجیب سے لوگ تھے" نپولین نے کہا "اپنی ہی بدمستیوں اور خرمستیوں میں ڈوبے ہوئے تھے ان کو پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ مینوئیل کہاں ہے اور کس کے پاس ہے۔"

"ان کو ٹکٹکی پر کسنا تھا' ان کاغذی شیروں کو۔" ماؤ نے غصے سے کہا۔

"میں نے ان کو مشکیں باندھ کر کیمپ حاضر کر دیا تھا لیکن وہ سارے الول جلول سے لوگ تھے۔ سارے کا سارا گروہ جھگڑے لوگوں پر مشتمل تھا۔ کوئی کہتا تھا میرے دادا کے پاس ہوتا تھا یہ مینوئیل میں نے دیکھا ضرور ہے لیکن پھر پتہ نہیں کہاں گیا ------ ایک عورت کہتی تھی میری نانی کے سسرال والے اسے پڑھا کرتے تھے لیکن وہ سارے مر کھپ گئے۔ اب پتہ نہیں کس کے پاس ہوگا۔"

"اسے تلاش کرنا بونا پارٹ ..... اگر تمہاری جگہ میں ہوتا تو کبھی خالی ہاتھ واپس نہ آتا۔"

"یہ تمہارے زمانے کی چیز نہیں سکندر۔ تم سے بعد کی ہے۔" نپولین نے کہا۔ "اس میں انسان کی زندگی کا مکمل زائچہ موجود ہے اور ترقی کے لئے اور آنے والے زمانوں کے لئے کھلا راستہ دے دیا گیا ہے۔"

"میں نے استاد زماں سے ایک ایسا ہی مینوئل بنانے کی درخواست کی تھی۔" سکندر نے کہا "اور انہوں نے بنایا بھی ..... لیکن وہ چل نہیں سکا۔"

"یہ ارسطو کے بس کا روگ نہیں تھا سکندر اور نہ ہی یہ کسی اور انسان کے بس کی ..... بات ہے ..... اصل میں یہ ایک اور ہی چیز ہے ....." میں نے چیخ کر کہا "تم مسلمان تو نہیں ہو گئے بونا پارٹ' ایک فنڈا مینٹلسٹ قسم کے مسلمان۔"

نپولین نے ہنس کر کہا "مجھے کیا ضرورت پڑی ہے مسلمان ہونے کی اور مجھے کیا خوشی مل سکتی ہے اس گروہ میں داخل ہونے سے؟ پہلے ہی اس دنیا میں کروڑوں مسلمان موجود ہیں انہوں نے کیا کر لیا۔"

سکندر نے کہا "اگر یہ مینوئل میرے زمانے میں ہوتا اور مجھے مل جاتا تو میں ساری دنیا کو فتح کرنے کے بجائے سارے کرہ ارض کو سوکھا کر دیتا۔" پھر اس نے ذرا سا سوچ کر کہا "مجھے میرے حضرت دیو جانس کلبی نے ایک مرتبہ فرمایا بھی تھا....."

"لیکن میں نے اسے مزید بات کرنے کا موقع نہیں دیا۔ غضب خدا کا' ایسے باہمت' باعمل اور نعرہ و پکار کے سمبل' عمل و حرکت کے دیوانے طرفداران عمل اور موضوع کیا چھیڑ کر بیٹھ گئے۔ وہ میرے مہمان تھے اور بہت ہی معزز مہمان تھے ڈاکٹر فرخندہ' لیکن پتہ نہیں ان کو ہو کیا گیا تھا۔ آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے کو آ رہے تھے۔ ویسے ایسے ہو سکتا ہے پروفیسر؟"

"جی ضرور ہو سکتا ہے۔" پروفیسر مسعود نے کہا "ہو کیوں نہیں سکتا۔ زندگی میں سبھی کچھ ہو سکتا ہے۔"

"لعنت ایسی زندگی پر" بختیار خان نے چڑ کر کہا "جو موج آگے بڑھنے کے لئے بنی ہے وہ پیچھے کیسے جا سکتی ہے۔"

"ابا جی" پروفیسر مسعود نے ذرا مکڑے ہو کر کہا "زندگی کوئی جامد چیز تھوڑی ہے کہ حکم کے تحت ایک ہی مقام پر پڑی رہے یہ تو ایک رواں دواں کائنات ہے۔ آگے بھی جاتی ہے اور پیچھے بھی آتی ہے دائیں بائیں اوپر نیچے ہر طرف گھوم جاتی ہے۔ نہ آگے کوئی حد ہے نہ پیچھے زندگی جو ہوئی ابا جی۔"

ابا جی بختیار خان نے اپنے جاہل بیٹے کو جھڑکی دینے کے لئے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی مگر ان کے پپوٹے اٹھ نہ سکے۔ انھوں نے نفرت اور ناراضگی کی چند تیوریاں اپنے ماتھے پر ڈالیں اور چھوٹے بڑے سانس لینے لگے۔

خانساماں سوپ کی ٹونٹی دار پیالی لے کر اندر آیا تو میجر فرخندہ نے اسے ہاتھ کے اشارے سے پیالی تپائی پر رکھنے کے لئے کہا۔ وہ الوؤں کی طرح دیدے گھما کر ادھر ادھر دیکھتا رہا اور احمق پنے سے اپنی باچھیں پھیلاتا اور سکیڑتا پیالی ہاتھ میں لے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ مسعود نے سر کے اشارے سے فرخندہ کو سمجھایا کہ ٹھیک ہے اسے جانے دو۔

رات کو تو ابا جی ٹھیک رہے اور رات کو اپنا جوس اور سوپ لے کر تھوڑی دیر کے لئے سو بھی گئے لیکن دوائیں لینے کے بعد ان کی بے چینی میں اضافہ ہو گیا۔ میجر فرخندہ نے ان کو ڈرپ لگانے کی کوشش کی تو انھوں نے اشارے سے منع کر دیا پھر جب وہ ان کا بی پی چیک کرنے لگی تو سر کے اشارے سے روک کر اپنے بستر سے اٹھا دیا فرخندہ نے ان کا پپوٹا کھول کر آنکھ کا معائنہ کرنا چاہا تو انھوں نے کافی مضبوطی کے ساتھ ان کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اٹنڈنٹ نرس کہنے لگی "ڈاکٹر صاحب ابھی رہنے دیں تھوڑی دیر بعد آکر چیک کر لیجئے گا۔"

بختیار خان نے بھرپور آواز میں پوچھا "اور کون ہے تمہارے ساتھ فرخندہ" تو نرس نے کہا "میں ہو سر فرزانہ۔"

"ٹھیک ہے" انھوں نے مربیانہ انداز میں پوچھا "اپنی ڈیوٹی پر آ گئی ہو۔"

"جی سر۔"

میجر فرخندہ نے فرزانہ کو دروازے کے پاس بلا کر کہا "دیکھو میں اپنے کمرے میں ہوں۔ اگر ابا جی کو ذرا سی بھی بے چینی ہو تو مجھے فوراً اطلاع دینا۔"

"ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب" فرزانہ نے مدہم آواز میں کہا "مجھے معلوم ہے۔"

میجر فرخندہ چلی گئی تو فرزانہ نے کرسی پر بیٹھ کر اپنے ناول سے خلال کی نشانی نکالی اور مریض پر ایک نظر ڈال کر ناول پڑھنے لگی۔ اس وقت ناول میں بلی کتوں کی لڑائی ہو رہی تھی۔

صبح سویرے فجر کی اذان کے ساتھ ہی بختیار خاں کی حالت غیر ہو گئی اور ان کی سانس رک رک کر چلنے لگی۔ چند لمحے تو فرزانہ نے ان کی نبض دیکھ کر اور ان کا بی پی چیک کر کے گزار دیئے لیکن جب ان کے حلق سے عجیب سی آوازیں نکلنے لگیں تو وہ گھبرا کر ڈاکٹر فرخندہ کو جگانے چلی گئی۔ ڈاکٹر فرخندہ ہڑبڑا کر اٹھی تو اس نے فرزانہ کی شکل دیکھ کر اسے محمود بھائی اور مسعود بھائی کو بھی اٹھانے کے لئے کہا۔ ابا جی کے کمرے میں پہنچ کر فرخندہ نے مریض کی حالت دیکھی تو لپک کر گیلری میں پڑے فون پر ڈاکٹر قدیر کو اطلاع دی۔ اور جب فون کر کے واپس مریض کے کمرے میں گئی تو محمود بھائی اور مسعود بھائی دونوں موجود تھے اور ابا جی کے بستر کے پاس کھڑے تھے۔ محمود نے ہاتھ کے اشارے سے فون کی بابت پوچھا تو فرخندہ نے سر ہلا کر کہا "کر دیا ہے اور ڈاکٹر صاحب پہنچ رہے ہیں۔"

تھوڑی دیر تک تینوں اسی طرح اپنے باپ کے گرد کھڑے رہے اور فرزانہ چارٹ میں کچھ بھرتی رہی۔ پھر اچانک مریض کا سانس نارمل ہو گیا اور اس نے اپنی آنکھیں نیم وا کر کے اور پتلیاں گھما کے تینوں کو باری باری سے اور آنکھیں بند کرتے ہوئے پوچھا "ڈاکٹر قدیر کو فون کیا۔"

"جی ابا جی" ڈاکٹر فرخندہ نے جواب دیا۔

"پہنچ رہا ہے؟"

"جی ابھی آ رہے ہیں"۔

"جاگا ہوا تھا؟"

"جی' نماز پڑھ کر سیر پر جانے والے تھے۔"

"اب تو سیدھا یہاں آئے گا ناں۔"

"جی اب تو سیدھے ہماری طرف ہی آ رہے ہیں۔"

"اچھا یہ بتی بجھا دو اور کھڑکیوں سے پردے ہٹا دو۔ باہر سے بڑی اچھی روشنی آ رہی ہے۔"

"جی بہت اچھا"

میجر فرخندہ کھڑکیوں سے پردے ہٹانے لگی تو فرزانہ نے اپنی سیٹ سے اچھل کر فرخندہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "ٹھہریں ڈاکٹر صاحب یہ میں کر دیتی ہوں آپ آرام سے بیٹھ جائیں "ڈاکٹر فرخندہ اپنے دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر آرام سے کرسی پر بیٹھ گئی۔

تھوڑی دیر بعد دروازے کی گھنٹی بجی اور نرس فرزانہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ ڈاکٹر قدیر تشریف لے آئے تھے اور فرزانہ ان کا بیگ اٹھا کر اندر داخل ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے آتے ہی سب سے پہلے مریض کا چارٹ دیکھا۔ پھر ڈاکٹر فرخندہ سے پوچھا۔ "خاں صاحب نے رات کیسے گزاری؟"

"بے چینی میں۔ بڑی بے چینی میں" بختیار خاں نے مجسم کراہ بن کر کہا" یہ رات بہت ہی لمبی ہو گئی تھی ڈاکٹر صاحب' بڑی مشکل سے صبح کی ہے۔"

"ویسے تو آپ ٹھیک ہیں؟" ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔

"ویسے ٹھیک ہوتا تو آپ کو کیوں فون کرواتا۔" بختیار خاں نے جھڑک کر کہا "مجھے آپ کے درشنوں کا شوق تو نہیں ہے۔"

ڈاکٹر کی آمد کا سن کر مسعود اور محمود بھی اندر آکر کھڑے ہو گئے۔ ان کے چہروں پر کم خوابی کے اثرات نمایاں تھے اور وہ کچھ بیزار سے نظر آ رہے تھے ڈاکٹر قدیر نے محمود کی طرف رخ کر کے کہا "انھیں ہسپتال شفٹ کرنا پڑے گا محمود صاحب اور نیورو فزیشن اور نیورو سرجن کو کنسلٹ کرنا ہو گا۔ میں انھیں فون کر دیتا ہوں۔" محمود نے اثبات میں سر ہلایا تو ابا جی بختیار خاں نے چڑ کر کہا "مجھے کوئی دماغی عارضہ نہیں ہے ڈاکٹر صاحب جو آپ مجھے نیورو فزیشن کے حوالے کرنا چاہتے ہیں۔ ذرا سی ہارٹ کنڈیشن ہے جو بلڈ پریشر کی زیادتی سے پیدا ہو گئی ہے۔ میں گھر پر ہی ٹھیک ہوں۔ آپ میری دوائیں تبدیل کر دیجئے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے خاں صاحب۔" ڈاکٹر قدیر نے تسلی آمیز لہجے میں کہا" میں دوائیں تبدیل کر دیتا ہوں لیکن ایک دوسری او پینین لینے میں کوئی حرج بھی نہیں۔"

بختیار خاں نے ڈاکٹر صاحب کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور آنکھیں بند کئے اسی طرح لیٹے رہے سب نے خاموشی کے ساتھ ایک دوسرے کو دیکھا اور مزید خاموش ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب ایک مرتبہ پھر الٹ پلٹ کے چارٹ دیکھنے میں مصروف ہو گئے اور فرزانہ جھک کر کمبل کے کنارے گدے تلے دبانے میں مصروف ہو گئی۔

ابا جی بختیار خاں نے آنکھیں کھولے بغیر آہستہ سے پوچھا " ڈاکٹر صاحب چلے گئے؟"

"جی نہیں۔" ڈاکٹر قدیر نے کہا "میں موجود ہوں۔"

"کل شام عصر اور مغرب کے درمیان ڈاکٹر صاحب" بختیار خاں نے اپنی پاٹ دار آواز میں کہا "برانڈرتھ روڈ پر قارون صاحب سے ملاقات ہوئی۔"

"قارون سے؟" ڈاکٹر قدیر نے حیرت سے پوچھا۔

"جی ڈاکٹر صاحب' قارون سے ----- میں نے پہلے تو انھیں کبھی نہیں دیکھا لیکن کل اچانک ان کی زیارت ہو گئی۔ وہ سرخ و سیاہ رنگ کی اوپن بگھی میں زر بفت کا قیمتی گاؤن پہنے کھڑے تھے اور سینکڑوں معززین علاقہ ان کی گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاگ رہے تھے۔ یہ اوپن بگھی کمپنی نے خاص طور ان کے لئے بنا کر بھیجی تھی اور اس کے دونوں طرف ریشم اور کمخواب کی جھولیں لٹک رہی تھیں۔ لوگ اہلاً و سہلاً مرحبا کہتے ہوئے ان کی گاڑی کے ساتھ ہو لئے جا رہے تھے اور گاڑی کے پیچھے تیس چالیس چاق و چوبند باوردی ملازموں کا ایک دستہ ان کی کنجیوں کی بھاری بھرکم چین اٹھائے چلا آ رہا تھا۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر ان کو سلام کیا لیکن انھوں نے میری طرف دیکھا نہیں۔ معززین کے گروہ جو اس کی گاڑی کے ارد گرد تیز تیز چل رہے تھے' ایک دوسرے سے کہتے جا رہے تھے' کیا ہی خوب ہوتا اگر یہ دولت' یہ ساز و سامان' یہ کروفر' یہ مال و زر ہم کو بھی ملتا اور ہم بھی قارون کی طرح عیش کرتے ------ تیز رفتار گروہ میں سے ایک نے نعرہ لگایا۔ "صاحب نصیب!" اور ہم سب نے مل کر جواب میں نعرہ لگایا "خوش نصیب' خوش نصیب۔" نوجوان نے نعرہ مارا "بھاگ بھرا اور طالع مند"" ہم نے جواب میں نعرہ مارا "قسمت والا دولتمند" نوجوان نے کہا "ذی ثروت سردار ہے" ہم نے کہا "دھن والا زردار ہے۔ دھنی ہے مایہ دار ہے۔" قارون ہاتھ ہلا ہلا کر اور مسکرا مسکرا ہمارے نعروں کا جواب دیتے جا رہے تھے اور ہمیں بے چین ہو کر ساتھ ساتھ بھاگنے سے روک رہے تھے کہ چلو ضرور مگر آہستہ چلو۔ ہمارا یہ قافلہ برانڈرتھ روڈ سے شاہ عالمی کی طرف جا رہا تھا اور لوگ

اپنا اپنا کام چھوڑ کر اس جلوس میں شریک ہو رہے تھے۔ ہر شخص مسرور و شاداں تھا اور ہر چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ اتنے بڑے رتبے والے مالدار اور زردار امیر اور امراء کے جلوس میں بھاگنا اتنی بڑی سعادت تھی جو صرف ان لوگوں کو نصیب ہوئی جنہوں نے آپ کی زیارت کی ------ آپ سن رہے ہیں ناں میری بات ڈاکٹر صاحب؟"

"جی جی سن رہا ہوں" ڈاکٹر قدیر نے کہا "بڑے غور سے سن رہا ہوں۔"

"لیکن ڈاکٹر صاحب کراؤن بس اڈے سے ذرا آگے بابا غلام محمد ٹنڈا لوہے کچرے کا ٹھیلہ دھکیلتا ہوا چلا آرہا تھا۔ لوگوں نے لپک کر اس کا ٹھیلہ ایک طرف کرنے کی کوشش کی لیکن وہ بہت بھاری تھا اور آپ کی سواری قریب پہنچ گئی تھی۔ بابے ٹنڈے نے روزمرہ کا معمول سمجھ کر اپنا ٹھیلہ ہجوم میں سے گزارنا چاہا تو آپ کی پجیرو اس کے آدھ ٹن وزنی ٹھیلے سے رک کر کھڑی ہو گئی۔ جب بابے گاموں نے جھومتے ہوئے لوگوں کا گیت سنا: دھن والا زردار ہے دھنی ہے مایہ دار ہے۔ سلام ہو سلام ہو۔ ہم پر بھی انعام ہو ------ تو بابے غلام محمد نے میلے سلوکے سے اپنا واحد بازو اوپر اٹھا کر اور ہاتھ کی اوٹ سے آنکھوں کی دھوپ روک کر اونچی آواز میں ہم سے کہا "اوے تمہارا ناس جائے تم اس دولت پر کیا للچاتے ہو اللہ تعالیٰ کے گھر کا ثواب اس دنیاوی کروفر سے ہزار درجہ بہتر ہے اور یہ نعمت ان لوگوں کو ملتی ہے جو دنیا کی حرص و طمع سے صبر کرتے ہیں" ------ قارون صاحب نے تو اس بات کا برا ماننا ہی تھا ہم سب کو بھی اس احمق کی جسارت پر بڑا غصہ آیا سنہرے مستقبل کی طرف بڑھنے والے نوجوانوں نے تالیاں بجا بجا کر گانا شروع کر دیا۔

فقرا ہے نادار ہے
مورکھ اور نادان ہے
بابا گاموں ڈھانڈا ہے
عقل کے نام پہ آنڈا ہے

جب شور ذرا تھما اور قارون صاحب نے ڈرائیور کو گاڑی بڑھانے کا اشارہ کیا تو بابا گاموں مجسم تحیر بنا کر قارون صاحب کو دیکھے جا رہا تھا اور اپنے ٹھیلے سمیت وہیں جما کھڑا تھا۔ قارون صاحب نے کڑک کر کہا "او مفلس، کنگلے، بھوکے، شودے، دہاڑی دار! تجھے پتہ نہیں میں کون ہوں؟" تو گاموں نے اپنا واحد بازو ہوا میں لہرا کر احمقوں کی طرح جواب دیا "مجھے اچھی طرح سے معلوم ہے قارون کہ تو کون ہے۔ لیکن اپنے آپ پر اور اپنی ذات پر اتنا گھمنڈ نہ کر کیونکہ خدا گھمنڈ کرنے والے متکبر آدمیوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور اگر خدا نے اپنی مہربانی سے اور اپنے کرم سے تم کو اتنا دے رکھا ہے تو اس میں کچھ اپنی قوم کے لوگوں کو بھی دے اور اس دنیا میں آخرت کی جستجو بھی کر۔ اور اس دنیا سے اپنا حصہ آخرت میں لے جانا نہ بھول۔" پھر بابے گاموں نے اونچی آواز میں کہا "میری بات کان کھول کے سن لے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے تو بھی بندوں کے ساتھ احسان کر اور اس دنیا میں اپنی دولت کے زور پر فساد نہ پھیلا میرا سوہنا اللہ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا" ------ پھر ڈاکٹر صاحب! قارون صاحب نے پجیرو میں کھڑے کھڑے اپنے لاؤڈ سپیکر کا بٹن آن کیا اور مائیک پر فرمایا۔ "اے لوگو غور سے سن لو اور اچھی طرح سے جان لو کہ مجھ کو یہ سب کچھ میری ذاتی عقل اور ہنرمندی سے ملا ہے اور یہ سارا مال میں نے اپنی دانش کے زور پر جمع کیا ہے اور کوشش، جدوجہد، سعی مسلسل کا جو علم مجھے حاصل ہے اور جس کو بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ سازگار کر کے اپنے آپ کو سنوارتا، اپنی ذات کو ابھارتا اور اپنے مال کو انبارتا رہتا ہوں۔ یہ سب کچھ اس علم سے اور اس حکمت سے حاصل ہوا ہے۔ میں اپنی محنت، کوشش، تگ و دو، تجویز اور تن دہی سے حاصل کیا ہوا مال کیوں کسی کو دوں اور اپنے علم، اپنی ہنرمندی اور اپنی عقل پر کیوں نہ ناز کروں؟" ڈاکٹر صاحب میں تو حیران رہ گیا! آپ سن رہے ہیں ناں؟"

"جی جی میں سن رہا ہوں۔"

"آپ غور سے سن رہے ہیں ناں جو انہوں نے فرمایا؟"

"جی میں نے ایک ایک بات غور سے سنی ہے اور ہر ہر فقرے پر غور کیا ہے۔"

کیا شان تھی ان کی ڈاکٹر صاحب۔" ابا جی بختیار خاں نے کہا "اور کیا رعب اور جلال تھا ان کے چہرے پر، اور کیا روشنی تھی ان کے ماتھے پر خود سازی اور خود مختاری کی کہ میں تو ششدر رہ گیا۔ ان کے انداز گفتار اور عظمت کردار نے مجھے ان کا گرویدہ کر لیا۔ وہ انسان تو نہیں نظر آرہے تھے ڈاکٹر صاحب، عزم و ہمت، خود شناسی، علم و حکمت اور فہم و فہمید کے دیوتا نظر آتے تھے ------ میں اس عمر اور اس بیماری کے باوجود ان کی پجیرو کے ساتھ ساتھ بھاگتا رہا، نہ میری سانس پھولی، نہ ہارٹ بیٹ میں اضافہ ہوا۔ نہ بلڈ پریشر بڑھا اور نہ ہی میں نے تھکاوٹ محسوس کی۔ وہ ایک عجیب سماں تھا، عجیب منظر تھا اور عجیب وقت تھا۔ ڈاکٹر صاحب دنیا کی ایک مقتدر، مقدس، محترم اور ذی عزت و عالی خیال ہستی مجھ سے چند گز کے فاصلے پر

تھی اور میں ساون کی برکھا میں نہاتے بچے کی طرح شاداں و فرحاں ان کی گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاگ رہا تھا ------ پتہ نہیں اب ان کی زیارت نصیب ہوتی ہے یا نہیں پھر یہ موقع ہاتھ آتا ہے کہ نہیں۔ اور پھر مرے بھاگ جاگتے ہیں یا نہیں کیونکہ اب تو میں زندہ ہی اس پر ہوں کہ ایک مرتبہ پھر ان کی زیارت ہو جائے اور میں اور بھی قریب سے ان کو دیکھ لوں' ان سے مل لوں' ان سے بات کر لوں۔"

یہ کہہ کر ابا جی بختیار خاں خاموش ہو گئے اور ان کے ہونٹوں پر پیپڑی سی جم گئی۔ ڈاکٹر قدیر نے گھڑی دیکھی اور اہل خانہ سے کچھ کہے بغیر مریض کے کمرے سے باہر نکل آئے۔

پورچ کی طرف چلتے ہوئے جب پروفیسر مسعود نے ڈاکٹر قدیر سے پوچھا کہ ابا جی کو کس وقت ہسپتال شفٹ کیا جائے تو ڈاکٹر صاحب نے ان کا کندھا تھپتھپا کر کہا "میرا خیال ہے۔ اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ کل تک انتظار کر کے پھر کوئی فیصلہ کریں گے۔"

---

28 ۩ إِنَّ قَٰرُونَ كَانَ مِن قَوْمِ مُوسَىٰ فَبَغَىٰ عَلَيْهِمْ ۖ وَءَاتَيْنَٰهُ مِنَ ٱلْكُنُوزِ مَآ إِنَّ مَفَاتِحَهُۥ لَتَنُوٓأُ بِٱلْعُصْبَةِ أُو۟لِى ٱلْقُوَّةِ إِذْ قَالَ لَهُۥ قَوْمُهُۥ لَا تَفْرَحْ ۖ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يُحِبُّ ٱلْفَرِحِينَ ﴿٧٦﴾ وَٱبْتَغِ فِيمَآ ءَاتَىٰكَ ٱللَّهُ ٱلدَّارَ ٱلْءَاخِرَةَ ۖ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ ٱلدُّنْيَا ۖ وَأَحْسِن كَمَآ أَحْسَنَ ٱللَّهُ إِلَيْكَ ۖ وَلَا تَبْغِ ٱلْفَسَادَ فِى ٱلْأَرْضِ ۖ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يُحِبُّ ٱلْمُفْسِدِينَ ﴿٧٧﴾ قَالَ إِنَّمَآ أُوتِيتُهُۥ عَلَىٰ عِلْمٍ عِندِىٓ ۚ أَوَلَمْ يَعْلَمْ أَنَّ ٱللَّهَ قَدْ أَهْلَكَ مِن قَبْلِهِۦ مِنَ ٱلْقُرُونِ مَنْ هُوَ أَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَأَكْثَرُ جَمْعًا ۚ وَلَا يُسْـَٔلُ عَن ذُنُوبِهِمُ ٱلْمُجْرِمُونَ ﴿٧٨﴾ فَخَرَجَ عَلَىٰ قَوْمِهِۦ فِى زِينَتِهِۦ ۖ قَالَ ٱلَّذِينَ يُرِيدُونَ ٱلْحَيَوٰةَ ٱلدُّنْيَا يَٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ أُوتِىَ قَٰرُونُ إِنَّهُۥ لَذُو حَظٍّ عَظِيمٍ ﴿٧٩﴾ وَقَالَ ٱلَّذِينَ أُوتُوا۟ ٱلْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ ٱللَّهِ خَيْرٌ لِّمَنْ ءَامَنَ وَعَمِلَ صَٰلِحًا وَلَا يُلَقَّىٰهَآ إِلَّا ٱلصَّٰبِرُونَ ﴿٨٠﴾ فَخَسَفْنَا بِهِۦ وَبِدَارِهِ ٱلْأَرْضَ فَمَا كَانَ لَهُۥ مِن فِئَةٍ يَنصُرُونَهُۥ مِن دُونِ ٱللَّهِ وَمَا كَانَ مِنَ ٱلْمُنتَصِرِينَ ﴿٨١﴾ وَأَصْبَحَ ٱلَّذِينَ تَمَنَّوْا۟ مَكَانَهُۥ بِٱلْأَمْسِ يَقُولُونَ وَيْكَأَنَّ ٱللَّهَ يَبْسُطُ ٱلرِّزْقَ لِمَن يَشَآءُ مِنْ عِبَادِهِۦ وَيَقْدِرُ ۖ لَوْلَآ أَن مَّنَّ ٱللَّهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا ۖ وَيْكَأَنَّهُۥ لَا يُفْلِحُ ٱلْكَٰفِرُونَ ﴿٨٢﴾ 28

یہ ایک واقعہ ہے کہ قارون موسیٰ کی قوم کا ایک شخص تھا' پھر وہ اپنی قوم کے خلاف سرکش ہو گیا۔ اور ہم نے اس کو اتنے خزانے دے رکھے تھے کہ ان کی کنجیاں طاقت ور آدمیوں کی ایک جماعت مشکل سے اٹھا سکتی تھی۔ ایک دفعہ جب اس کی قوم کے لوگوں نے اس سے کہا "پھول نہ جا' اللہ پھولنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ جو مال اللہ نے تجھے دیا ہے اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کر اور دنیا میں سے بھی اپنا حصہ فراموش نہ کر۔ احسان کر جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے' اور زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش نہ کر' اللہ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا۔" تو اس نے کہا "یہ سب کچھ تو مجھے اس علم کی بنا پر دیا گیا ہے جو مجھ کو حاصل ہے" ------ کیا اس کو یہ علم نہ تھا کہ اللہ اس سے پہلے بہت سے ایسے لوگوں کو ہلاک کر چکا ہے جو اس سے زیادہ قوت اور جمعیت رکھتے تھے؟ مجرموں سے تو ان کے گناہ نہیں پوچھے جاتے۔

ایک روز وہ اپنی قوم کے سامنے اپنے پورے ٹھاٹھ میں نکلا۔ جو لوگ حیات دنیا کے طالب تھے وہ اسے دیکھ کر کہنے لگے "کاش ہمیں بھی وہی کچھ ملتا جو قارون کو دیا گیا ہے' یہ تو بڑا نصیبے والا ہے۔" مگر جو لوگ علم رکھنے والے تھے وہ کہنے لگے افسوس تمہارے حال پر' اللہ کا ثواب بہتر ہے اس شخص کے لئے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے' اور یہ دولت نہیں ملتی مگر صبر کرنے والوں کو۔"

آخر کار ہم نے اسے اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا۔ پھر کوئی اس کے حامیوں کا گروہ نہ تھا جو اللہ کے مقابلے میں اس کی مدد کو آتا اور نہ وہ خود اپنی مدد آپ کر سکا۔ اب وہی لوگ جو کل اس کی منزلت کی تمنا کر رہے تھے کہنے لگے "افسوس' ہم بھول گئے تھے کہ اللہ اپنے بندوں میں سے جس کا رزق چاہتا ہے کشادہ کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے نپا تلا دیتا ہے۔ اگر اللہ نے ہم پر احسان نہ کیا ہوتا تو ہمیں بھی زمین میں دھنسا دیتا۔ افسوس ہم کو یاد نہ رہا کہ کافر فلاح نہیں پایا کرتے۔" ع

ڈرامہ ـــــ سگنل اور سنگل بینڈ ـــــ اشفاق احمد

کردار:

ڈاکٹر محبوب عزیز: پچپن برس کا قبول صورت ڈاکٹر
مس زاہدہ رفیق: اٹھائیس تیس برس کی ایک پروفیسر
رضیہ محبوب: ڈاکٹر محبوب کی بیوی
اشہر عزیز: ڈاکٹر محبوب کا ڈاکٹر بیٹا
اطہر عزیز: ڈاکٹر محبوب کا انجینئر بیٹا
مریم: ڈاکٹر محبوب کی بیٹی۔ ایم۔ اے کی طالبہ
لیلیٰ: اشہر کی بیوی
نوشی: ڈاکٹر محبوب کا پوتا۔ عمر دو سال
شمس: پچاس پچپن برس کا ایک خاموش ترین خانساماں
رحمان گل: ایک اور نجی ملازم
بوڑھا مریض، مسٹر نرس، کلینک کی سیکرٹری، ائر کمپنی کی ملازم لڑکی وغیرہ وغیرہ۔

سین 1 آؤٹ ڈور صبح کا وقت

(کوٹھی کے پورچ سے کچھ ہٹ کر بوگن ولا کی بیل کے پاس ایک لمبی سفید کار کھڑی ہے۔ یکدم بیل جیسے ہوا سے ہلتی ہے اس میں سے کچھ پھول ونڈ سکرین پر گرتے ہیں۔ اس وقت ڈاکٹر صاحب آتے اور کار کا دروازہ کھولتے ہیں۔ ان کے پیچھے پیچھے شمس ان کا بیگ اٹھا کر لاتا ہے اور ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ کا دروازہ کھول کر بیگ اندر رکھتا ہے۔ پھر وہ کار کی بونٹ کے اوپر گرے ہوئے پھول دیکھتا ہے۔ اس کے بعد نگاہ اٹھا کر اوپر لگی ہوئی بیل پر نظر ڈالتا ہے۔ اس وقت ڈاکٹر صاحب اندر بیٹھ کر کار روانہ کرتے ہیں۔

اب کار مختلف سڑکوں پر روانہ ہوتی ہے۔ ایک ساؤنڈ ایفکٹ علیحدہ تیار کیجئے۔ جب بھی کار دائیں یا بائیں مڑتی ہے، اس میں خاص قسم کی سیٹی کی آواز نکلتی ہے۔ اس کا لوپ تیار کیجئے اور ساؤنڈ ایفکٹ دیجئے۔

ڈاکٹر صاحب ـــــ اپنے کلینک کے سامنے کار روکتے ہیں۔ کلینک کے اوپر "محبوب کلینک" کا بڑا سا بورڈ لگا ہے۔) ـــــ کٹ

سین 2 ان ڈور وہی وقت

(محبوب صاحب کلینک کے بیرونی حصہ میں داخل ہوتے ہیں۔ یہاں بہت سے مریض اور ان کے لواحقین بیٹھے ہیں۔ ایک دو نرسیں کھڑی ہیں۔ ایک سیکرٹری ٹائپ رائٹر پر بل بنا رہی ہے۔ تمام لوگ ڈاکٹر کو سلام کرتے ہیں۔ ڈاکٹر اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلا جاتا ہے۔) ـــــ کٹ)

سین 3۔ ان ڈور۔ کچھ دیر بعد

(کلینک کا اندرونی حصہ۔ ڈاکٹر صاحب اپنی کرسی پر بیٹھے ہیں۔ سامنے ایک بوڑھا آدمی بیٹھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب میں بڑی خوش اخلاقی ہے۔ وہ بہت ہنس مکھ ہیں اور بڑی آہستگی اور شفقت سے بات کرتے ہیں۔)

بوڑھا: بس جی نیند نہیں آتی ڈاکٹر صاحب ـــــ ساڑھے نو بجے رات کو میں بیٹھا ہوں سونے کے لئے اور صبح فجر کی اذان ہو گئی بیٹھے بیٹھے۔ دو عمریں بسر کر لیں میں نے ایک رات میں!

ڈاکٹر: دیکھیں آپ سونے کے لئے بیٹھا نہ کریں ـــــ سونے کے لئے لیٹنا ضروری ہے۔ جو گولیاں میں نے آپ کو دی تھیں وہ استعمال کیں آپ نے؟

بوڑھا: کیں ڈاکٹر صاحب ـــــ لیکن جیسے میرے سر میں خشکی ہو گئی ہے کان بجتے ہیں میرے۔ آوازیں آتی رہتی ہیں لگاتار ـــــ مجھے لگتا ہے دروازے کھڑکیاں ٹیبل لیمپ سب بول رہے ہیں۔

ڈاکٹر: بیوی ہے بزرگو؟

بوڑھا: ہے جی۔ بڑھیا ہے۔ ساری رات خراٹے لیتی ہے۔

ڈاکٹر: اس سے کہیں سر میں تھوڑا سا بادام روغن جھس دیا کرے دوسرے چوتھے۔

بوڑھا: اسے ایسے کاموں کے لئے فرصت کہاں ڈاکٹر صاحب۔ پوتے پوتیاں نہیں چھوڑتے اسے۔ ایک کمر پر ایک کندھے پر..... ایک تختے سے لگا ہے۔ اوپر سے مکان بن رہا ہے میرے بیٹے کا۔

ڈاکٹر: اچھا میں دوا بدل دیتا ہوں۔ لیکن آپ تھوڑی سی احتیاط کریں اپنے

کھانے پینے میں۔ ماش کی دال چاول..... گوبھی..... ایسی چیزیں رات کو استعمال نہ کریں۔

بوڑھا: چلو ڈاکٹر صاحب نیند نہ آئے پر یہ آوازیں ہی بند ہو جائیں ---- پچھلے پہر تو مجھے اپنی نبض کی بھی آواز آنے لگتی ہے "عصر کے وقت!

ڈاکٹر: آوازیں بھی بند ہو جائیں گی۔ نیند بھی آنے لگے گی..... کوئی مشغلہ..... کوئی کام دام کیا کریں جب نیند نہ آئے۔

بوڑھا: تاش کا شوق ہے....... لیکن رات کو تاش کون کھیلے میرے ساتھ۔

ڈاکٹر: اللہ اللہ کیا کریں بزرگو...... اللہ اللہ ..... آپ کی عمر میں اس سے بہتر اور کیا مشغلہ ہو سکتا ہے؟

بوڑھا: جی چاہتا ہے ڈاکٹر صاحب۔ ضرور چاہتا ہے۔ کچھ دن باجماعت نماز بھی پڑھتا ہوں مسجد جا کر۔ باقاعدگی سے جاتا ہوں۔ پھر------ آپ ہی آپ یہ سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے۔ توجہ ہٹ جاتی ہے۔ من نہیں لگتا۔

ڈاکٹر: جب نیند نہ آئے تو درود شریف پڑھا کریں۔ اب اگلا پہر ہے۔ کچھ تیاری کریں اس کی.......

بوڑھا: ہم نے کیا تیاری کرنی ہے ڈاکٹر صاحب۔ ادھر عبادت کو ہاتھ ڈالوں ادھر گندے گندے خیالات ذہن کو گھیر لیتے ہیں۔ جو باتیں کبھی نہیں سوچیں وہ بھی گھیراؤ کر کے بیٹھ جاتی ہیں۔

ڈاکٹر: چلئے اچھا یہ (نسخہ ہاتھ میں دیتے ہوئے) وٹامن بی دو مرتبہ

بوڑھا: دو مرتبہ

ڈاکٹر: اور یہ گولی رات کو سونے سے پہلے دودھ کے ساتھ۔ -----کٹ

سین 4 ان ڈور کچھ دیر بعد

(کلینک کے پہلے کمرے میں مس زاہدہ رفیق سیکرٹری کے پاس کھڑی ہے)

سیکرٹری: نام؟

زاہدہ: مس زاہدہ رفیق

سیکرٹری: (کارڈ بھرتے ہوئے) عمر؟

زاہدہ: انتیس سال

سیکرٹری: شادی شدہ؟

زاہدہ: جی نہیں

سیکرٹری: پیشہ؟

زاہدہ: ٹیچنگ

سیکرٹری: آپ بیٹھ جائیں وہاں۔ ابھی ڈاکٹر صاحب سے اپوائنٹ منٹ لیتے ہیں۔ سسٹر ذرا اندر دیکھنا ڈاکٹر صاحب کے پاس۔

(مس زاہدہ رفیق بنچ پر بیٹھ جاتی ہے۔ سسٹر اندر جاتی ہے۔ سیکرٹری فون ملاتی ہے۔) ----کٹ

سین 5۔ ان ڈور۔ کچھ دیر بعد

(اس وقت زاہدہ ڈاکٹر کے تشخیصی ٹیبل پر لیٹی ہوئی ہے اور لمبے لمبے سانس لے رہی ہے۔ ڈاکٹر سٹیتھسکوپ لگا کر اسکا معائنہ کرتا ہے۔ پاس نرس کھڑی ہے۔)

ڈاکٹر: ذرا اٹھیں۔

(زاہدہ اٹھتی ہے)

ڈاکٹر: ذرا سویٹر اتاریں۔

(زاہدہ سویٹر اتارتی ہے۔ نرس اس کی مدد کرتی ہے۔ اب ڈاکٹر اس کی پشت پر سٹیتھسکوپ لگا کر اس کا معائنہ کرتا ہے۔ پاس نرس کھڑی ہے۔)

ڈاکٹر: ان کا بلڈ پریشر بھی چیک کرلیں سسٹر۔

(نرس بلڈ پریشر چیک کرتی ہے اور پرچی پر لکھتی ہے۔ ڈاکٹر اپنی سیٹ پر آکر بیٹھتا ہے اور زاہدہ سے اگلے مکالمات کرنے لگتا ہے۔ بلڈ پریشر چیک ہونے کے بعد زاہدہ ڈاکٹر کی میز کے سامنے آکر بیٹھتی ہے۔ نرس پرچی ڈاکٹر کے سامنے رکھ دیتی ہے---ڈائیلاگ کا سلسلہ جاری ہے۔)

ڈاکٹر: یہ آپ کو جو SEVERE HEADACHES رہتی ہیں تو ان کی ڈیوریشن کیا ہوتی ہے۔ اوسطاً؟

زاہدہ: کبھی تو دو دو دن بھی اٹیک رہتا ہے ڈاکٹر صاحب مسلسل --- لیکن عموماً چھ سات گھنٹے تو ضرور رہتا ہے سر درد --- یہاں کنپٹی تو پھٹنے لگتی ہے۔

ڈاکٹر: آئیز ٹسٹ کرا کے دیکھیں آپ نے؟

زاہدہ: جی عینک تو مجھے بچپن سے لگی ہوئی ہے۔

ڈاکٹر: کئی دفعہ نمبر بدل جاتا ہے۔

زاہدہ: ابھی میں نے پچھلے ہفتے ٹسٹ کروائی تھیں آنکھیں۔ وہی نمبر ہے 75ء—۔

ڈاکٹر: پروفیسر صاحب! جب آپ کو BRONCHITIS ہوا ہے۔ اس کے بعد سے یہ سر درد ہے کہ پہلے سے؟

زاہدہ: میرا خیال ہے جی کہ یہ سر درد تو مجھے پہلے سے ہے Bronchitis کے بعد شدید ہو گئے ہیں اس کے اٹیک --- جب سے میں نے سروس شروع

کی ہے یہ سر درد رہنے لگا --- لیکن شروع میں میں نے اس کی پروا نہیں کی۔

ڈاکٹر: کتنے سال ہو گئے ہیں آپ کو سروس میں؟

زاہدہ: پانچ سال

ڈاکٹر: آپ ہوسٹل میں رہتی ہیں کہ اپنے پیرنٹس کے پاس؟

زاہدہ: ہوسٹل میں رہتی ہوں ڈاکٹر صاحب ...... وارڈن ہوں اپنے ونگ کی۔

ڈاکٹر: اچھا تو جی --- اب

(نسخہ لکھتا ہے)

کیا نام بتایا آپ نے؟

زاہدہ: زاہدہ رفیق

ڈاکٹر: مس؟

زاہدہ: جی مس زاہدہ رفیق

ڈاکٹر: کچھ ٹسٹ مجھے کرنے پڑیں گے۔

(گھنٹی بجاتا ہے)

آپ سردست تو یورین' سٹول اور بلڈ ٹسٹ کروالیں --- مجھے کچھ SINUS کا اندیشہ ہے۔ لیکن ان tests کے بعد بتا سکوں گا کسی قدر یقین کے ساتھ۔

زاہدہ: اچھا جی۔

ڈاکٹر: یہ ٹمپریری ریلیف کے لئے --- جب بھی درد ہو دو گولیاں --- اور یہ ٹانکس ہیں۔ سسٹر!

زاہدہ: (نسخہ پکڑتے ہوئے) تھینک یو ڈاکٹر صاحب

نرس: جی ڈاکٹر صاحب؟

ڈاکٹر: ان کا یورین' سٹول اور بلڈ ٹسٹ

نرس: جی ڈاکٹر صاحب۔

زاہدہ: (جاتے ہوئے مسکرا کر ڈاکٹر کو دیکھتی ہے) شکریہ ڈاکٹر صاحب

ڈاکٹر: یو آر ویلکم!

(ڈاکٹر بھی اس کی طرف دیکھ کر رسماً مسکراتا ہے۔) --- کٹ

سین 6۔ ان ڈور۔ رات

(بہت بڑا ڈائننگ ٹیبل --- اس میز پر آنے سے پہلے شمس دکھایا جاتا ہے۔ وہ ڈاکٹر محبوب کی کرسی کے پیچھے چپ چاپ کھڑا ہے۔ اس کے چہرے پر شفقت اور توجہ ہے۔ رضیہ' اشہر عزیز' لبنیٰ' اطہر عزیز اور مریم بیٹھے ہیں۔ رضیہ کی گود میں اس کا پوتا ہے جسے وہ اس وقت کھانا کھلا رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب ہلکی سی سوچ میں غرق ہیں۔)

لبنیٰ یہ تو اپنی دادی کی گود سے اترتا ہی نہیں لا بھی

اطہر: بھائی جان بچاؤ کر لیں ابھی سے --- امی اسے ایسا سینے پر لگائیں گی کہ پھر آپ کو حق شفع کر کے نوشی کو لینا پڑے گا۔ امی کے قبضے میں ہو گیا --- ختم

اشہر: اسے کیا ضرورت ہے نوشی کو لینے کی --- جب پل جائے گا تب واپس لے لے گی پلا پلایا۔

رضیہ: آپ کچھ چپ چپ ہیں ڈاکٹر صاحب۔

ڈاکٹر: نہیں میں سن رہا ہوں غور سے سب باتیں۔

مریم: میں تو آج کالج گئی ہی نہیں ابو۔

اطہر: جب لیکچر شارٹ ہوں گے ناں مس مریم تب پتہ چلے گا۔

مریم: ہماری سپورٹس ڈے کی چھٹی تھی۔ کوئی لیکچر شارٹ نہیں ہوں گے۔

ڈاکٹر: میرے کلینک پر آج ایک مس زاہدہ رفیق آئی تھیں۔ تمہارے کالج میں تو نہیں پڑھاتیں؟

مریم: (سوچتے ہوئے) زاہدہ رفیق؟ زاہدہ رفیق --- کیا سبجیکٹ ہے ابو؟

ڈاکٹر: ہسٹری ہے شاید!

اشہر: یہ کب کسی سے پڑھتی ہے کہ اسے پروفیسروں کے نام معلوم ہوں۔

(اب لبنیٰ اور رضیہ آہستہ آہستہ باتیں آپس میں کرنے لگتی ہیں اور ڈاکٹر کی باتوں میں دلچسپی نہیں لیتیں۔ اطہر کھانے میں مشغول ہے۔)

ڈاکٹر: تمہارے انٹرسٹ کا کیس تھا اشہر! psychosomatic سر درد بڑے عجیب symptoms تھے۔

اطہر: (بددلی سے) جی ابو ذرا مجھے کوفتے پکڑانا .....

ڈاکٹر: ہو سکتا ہے migraine ہو ...... ہو سکتا ہے sinus کی وجہ سے ہو۔

ماں: آپ کچھ کھائیں ڈاکٹر صاحب۔ آپ کے پسند کی کچنار گوشت پکی ہے۔

ڈاکٹر: میں بتا رہا تھا اس کو' مستقبل کے ڈاکٹر کو' ایک دلچسپ کیس۔

ماں: (بے توجہی سے) میں سن رہی تھی ڈاکٹر صاحب۔ آپ بتائیں۔ (پھر لبنیٰ سے زیر لب کچھ کہتی ہے)

ڈاکٹر: سر درد ہوتا ہے تو بائیں آنکھ سے آنسو نکلتے ہیں لیکن دائیں آنکھ خشک رہتی ہے۔

لبنیٰ: ان ملازم پیشہ خواتین کی شادی نہیں ہوتی ناں ابا جی --- اس لئے سر درد ہوتے ہیں ان کے۔ کیوں اماں جی۔

ماں: وقت پر رشتے بھی تو نہیں ملتے لبنیٰ --- وہ بھی کیا کریں۔

(اب ڈاکٹر صاحب اپنے خول میں چلے جاتے ہیں۔)

مریم: میں تو خود پروفیسر لگوں گی ایم اے کر کے۔

لبنیٰ: پھر شادی نہ ہوئی تیری مریم۔

مریم: میری تو تمام پروفیسروں کی شادی ہوئی وی اے ---

اطہر: لیکن تیری نہیں ہوگی ناں۔

ماں: کیا بکواس کرتے ہو۔

اشعر: اس کے بھی سردرد ہوا کرے گی۔

اطہر: اور بائیں آنکھ سے آنسو نکلا کریں گے۔

(سب ہنستے ہیں۔ شمس جھک کر ڈاکٹر سے کہتا ہے۔)

شمس: کافی سر؟

ڈاکٹر: نو تھینک یو شمس ------ کٹ

سین 7 آؤٹ ڈور صبح کا وقت

(ڈاکٹر صاحب اپنے گھر سے چھڑی لے کر نکلتے ہیں۔ نکلنے کے بعد گیٹ بند کرتے ہیں۔ پھر وہ سیر کرنے کے انداز میں چلتے ہیں۔) --- کٹ

سین 3 آؤٹ ڈور صبح کا وقت

(نہر کے کنارے کنارے ڈاکٹر صاحب چلے جا رہے ہیں اس دوران چھوٹے چھوٹے وقفوں کے بعد گھنٹیاں بجتی ہیں۔ جیسے قریب ہی کہیں گائے بھینسوں کے گلے کی گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ نہر کے کنارے سے جب ڈاکٹر صاحب گزرتے ہیں تو کنارے پر ایک بوڑھا بیٹھا ہے اور گا رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب پہلے پاس سے گزر جاتے ہیں۔ پھر اس فقیر صورت آدمی سے کچھ فاصلے پر آکر بیٹھ جاتے ہیں اور کان دھر کے سنتے ہیں۔)

بابا: (گاتا ہے)

عاشق ہوویں تاں عشق کماویں
شاہ عشق سوئی دا نکا' دھاگا ہوویں تاں ہی جاویں
باہر پاک اندر آلودہ' کیا تو شیخ کہاویں؟
کہے حسین جے فارغ تھیویں خاص مراتب پاویں

(آخر میں کیمرہ ڈاکٹر کے چہرے پر آتا ہے۔ گانا اور بیلوں کی گھنٹیاں آپس میں مل جل جاتی ہیں۔) --- کٹ

سین 9 ان ڈور صبح

(ڈاکٹر کے کلینک کا اندرونی حصہ۔ اس وقت زاہدہ ساڑھی میں ملبوس ہے اور ڈاکٹر صاحب کے سامنے والی کرسی میں بیٹھی ہے۔ پچھلی ملاقات کی نسبت اب وہ نسبتاً بشاش ہے۔)

زاہدہ: چھینکیں تو اب نہیں آرہیں ڈاکٹر صاحب۔ لیکن درد کل بھی ہو گیا تھا۔

ڈاکٹر: آپ ناک کا ایکسرے نہیں لائیں۔

زاہدہ: میں آپ کی چٹ لے گئی تھی ڈاکٹر مختار کے پاس۔ انہوں نے کوئی نوٹس ہی نہیں لیا میرا!

ڈاکٹر: اچھا؟

زاہدہ: آپ کا کیا خیال ہے ڈاکٹر صاحب sinus ہے؟

ڈاکٹر: جب تک ٹسٹ پورے نہ ہو جائیں مس زاہدہ رفیق میں کیا کہہ سکتا ہوں؟

زاہدہ: ڈاکٹر صاحب

ڈاکٹر: جی؟

زاہدہ: آپ میری بات توجہ سے نہیں سن رہے۔

ڈاکٹر: پوری توجہ سے بلکہ انتہائی توجہ کے ساتھ۔

زاہدہ: دیکھئے میری کوئی چار مہینے کی چھٹی ڈیو ہے with pay میں اپنا ڈیو پراویڈنٹ فنڈ نکلوا کے اور تھوڑا سا قرض لے کر اپنے ماموں کے پاس جا سکتی ہوں علاج کے لئے۔ وہ لندن میں ہیں۔

ڈاکٹر: لیکن اسقدر جلدی کیا ہے؟ آپ اطمینان رکھیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا معمولی تکلیف ہے۔

زاہدہ: پتہ نہیں کیا بات ہے ڈاکٹر صاحب لیکن ---- میری زندگی کا سارا پیٹرن ہی ایسا ہے۔ پہلے میں جن باتوں کو مسئلہ نہیں سمجھتی ...... وہی آخر میں بہت بڑا مسئلہ بن جاتی ہیں۔ وہی باتیں ---- وہی چھوٹے چھوٹے قضیئے..... اب مجھے لگتا ہے اگر میں نے اس سردرد کا علاج جلدی نہ کیا تو یہ کوئی بہت بڑی chronic disease بن جائے گی۔

ڈاکٹر: یہ تو آپ کا وہم ہے مس رفیق۔

زاہدہ: اسی طرح ڈاکٹر صاحب میرے ابو بھی کبھی بازو کے درد کی کمپلین کیا کرتے تھے تو ہم اسے وہم ہی سمجھا کرتے تھے --- اور اچانک .... ڈاکٹر صاحب ایک شام ہم سب چائے پی رہے تھے' ابو گھڑی باندھ رہے تھے اپنی کلائی پر اور.....

(یکدم رونے لگتی ہے)

پتہ ہی نہیں چلا...... وہ رخصت بھی ہو گئے اور ہم سب...... ہم نے اہمیت ہی نہ دی ان کی کسی بات کو.....

(ڈاکٹر اس کے پاس آتا ہے اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہے۔)

ڈاکٹر: آپ کا سر درد معمولی نوعیت کا ہے۔ تسلی رکھیں..... لیکن آپ کی تسلی کے لئے ناک کا ایکسرے بھی کروا لیتے ہیں۔

زاہدہ: کسی دن لڑکیوں کی حاضری کا رجسٹر دیکھتے دیکھتے میں بھی پار ہو جاؤں گی ابو کی طرح۔

ڈاکٹر: چلیں آئیں---اٹھیں۔

زاہدہ: کہاں؟

ڈاکٹر: میں آپ کو خود لے کے چلتا ہوں ڈاکٹر مختار کی لیبارٹری میں۔

زاہدہ: نہیں ڈاکٹر صاحب--- آپ کا بڑا ٹائم ویسٹ ہوگا۔ پھر باہر مریضوں کی قطار لگی ہے۔

ڈاکٹر: آپ بھی تو مریض ہیں۔ آیئے۔

زاہدہ: ہائے تھینک یو سو مچ ڈاکٹر صاحب!

ڈاکٹر: ہم اپنے ملک کے دانشوروں کو ایسے تھوڑی مرنے دیں گے۔ آیئے!

(آگے چل کر دروازہ کھولتا ہے۔ زاہدہ پہلے گزرتی ہے پھر ڈاکٹر۔ دونوں بیرونی حصے میں آتے ہیں۔ مریضوں سے بنچ بھرے ہیں۔ ڈاکٹر نرس سے کہتا ہے:)

ڈاکٹر: میں ابھی آتا ہوں نرس۔ ---کٹ

سین 10 آوٹ ڈور دوپہر

(کتابوں کی خوبصورت دکان پر ------ ڈاکٹر محبوب کتابیں نکالتا ہے۔ وہ اس وقت ایسے شیلف کے سامنے کھڑا ہے، جس میں پورنو گرافی اور شادی شدہ زندگی اور جنس کی کتابیں ہیں۔ کیمرہ اس کی پشت پر آتا ہے۔ وہ ایک کتاب نکالتا ہے اور کھول کر دیکھتا ہے۔ کیمرہ عنوان کو دکھاتا ہے:

"Marriage for Three"

پھر ایک اور کتاب کھولتا ہے۔ پھر کیمرہ عنوان دکھاتا ہے:

"how to please your spouse without trying"

ایک اور کتاب کھولتا ہے۔ لکھا ہے: "Sex Game"

(ایسی یا اسی قسم کی قدرے کم گرم کتابیں۔ سنسر کا خوف ہو تو اور بھی کم گرم کتابیں، لیکن ہوں ضرور) اسی طرح کی وہ پانچ چھ کتابیں لفافے میں ڈلوا کر کاؤنٹر بابو کے پاس پہنچتا ہے۔ اس وقت عقب میں چپڑاسی کو بلانے والی گھنٹی بار بار بجتی ہے۔ اس وقت کیش کلرک کے سامنے دو ایک اور بھی گاہک کھڑے ہیں اور ان کی کتابوں کے لفافے بھی میز پر پڑے ہیں ------ ڈاکٹر صاحب لاتعلق سے جیسے کچھ سوچ رہے ہیں ------ قیمت کاؤنٹر پر ادا کر کے وہ اپنا پیکٹ لے کر باہر نکل جاتے ہیں۔) ------کٹ

سین 11 ان ڈور شام

(ڈاکٹر محبوب گھر میں داخل ہوتے ہیں۔ ان کے پیچھے شمس بیگ اٹھائے اور ان کی کتابیں لئے آتا ہے اور بیڈ روم میں ان کی میز پر کتابیں رکھتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب صوفے پر بیٹھ کر کتابیں دیکھنے لگتے ہیں الٹ پلٹ کر پھر کیش میمو دیکھتے ہیں۔)

شمس: کافی سر؟

ڈاکٹر: پلیز شمس!

(شمس چلا جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب حیران ہیں کہ یہ تمام کتابیں کیسے بدل گئیں۔ وہ اپنے تحیر میں مبتلا ہیں اور رضیہ پاس کھڑی ساڑھی تہہ کر رہی ہے۔ پھر وہ ساڑھی ہینگر میں لٹکاتی ہے اور بول رہی ہے۔)

رضیہ: خدا کے لئے ڈاکٹر صاحب کچھ توجہ گھر کے معاملات پر بھی دیا کریں۔

ڈاکٹر: جی ضرور

رضیہ: آپ صرف جی کہہ دیتے ہیں کرتے کچھ نہیں۔ سولہ سو ایکڑ میں چانس تھا اچھا بھلا۔ آپ کے نام الاٹ ہو جاتی تھی زمین۔ آپ نے پروانہ کی۔ چیئرمین آپ کا مریض تھا۔

ڈاکٹر: کمال ہے۔ یعنی یہ تمام کتابیں...... لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

رضیہ: خدا کے لئے کچھ دیر کے لئے تو یہ کتابیں چھوڑیں۔ اب اسلام آباد کے ٹکڑے کے لئے ہی فون کر دیں مفتی صاحب کو۔ اب تو نمبر Ten میں زمین مل رہی ہے آگے چل کر یہ چانس بھی نہیں رہے گا۔

ڈاکٹر: ہم کیا کریں گے اسلام آباد میں زمین لے کر.....

رضیہ: ہم نہ رہیں گے۔ اشمر رہے گا۔

ڈاکٹر: اشمر تو ہمارے ساتھ رہ رہا ہے۔

رضیہ: چلئے کیا پتہ اطہر کا تبادلہ ہو جائے اسلام آباد کا۔

ڈاکٹر: تو وہ خود بنا لے گا گھر۔ اگر چاہے گا۔

رضیہ: تب تک کوئی زمین نہیں رہے گی اسلام آباد میں ------ اور رہے گی بھی تو اشرفیوں کے بھاؤ ملے گی ------ کمال ہے۔ سب اپنی اولاد کے لئے سوچتے ہیں، آپ کو کوئی فکر ہی نہیں۔

ڈاکٹر: ہم بھی کافی سوچتے ہیں۔ حسب توفیق۔

رضیہ: کم از کم تین کوٹھیاں تو ہمیں اب تک بنا لینی چاہئیں تھیں ----- تینوں بچوں کے لئے۔

ڈاکٹر: میرے خیال میں کم از کم نو---- تین تین ان تینوں کے بچوں کے لئے بھی تو چاہیئے ہوں گی۔

رضیہ: آپ تو Joke سمجھ رہے ہیں میری باتوں کو۔

ڈاکٹر: Joke تو آج میرے ساتھ ہو گیا رضیہ بیگم۔ میں مزدا بک ڈپو گیا تھا اور یہ دیکھو میری کتابیں پتہ نہیں کس کو چلی گئیں ------ اور یہ میرے ساتھ آگئیں۔ "Islam and Glory" "Road to Relaxation"

(جو کتابیں اس ضمن میں مہیا کی جائیں ان کے نام گنے جائیں۔)

(لیکن رضیہ ڈاکٹر صاحب کی بات میں دلچسپی نہیں لیتی۔ وہ ہینگر ٹانکتے ہوئے کہتی ہے۔)

رضیہ: ہو جاتا ہے ایسے۔ پرسوں میں بانو بازار سے دو بیڈ کور خرید کر لائی۔ گھر پہنچی تو چار غلاف نکلے...... گاؤ تکیوں کے۔

ڈاکٹر: تم آکر دیکھو تو سہی رضیہ ------ عجیب واقع ہے کیش میمو پر وہی کتابیں لکھی ہیں میرے چوائس کی۔ اور یہاں یہ ہیں!

رضیہ: ڈاکٹر صاحب پلیز میری بات سنیں۔ سال بھر کے بعد سیمنٹ اتنا مہنگا ہو جائے گا' اتنا مہنگا ہو جائے گا کہ پھر ہم جیسے کو ٹھی تو کیا باورچی خانے کی سل بھی مرمت نہیں کروا سکیں گے۔

(ڈاکٹر کے ماتھے پر تیوری آتی ہے۔ وہ الٹ پلٹ کر کتابیں دیکھتا ہے۔ پھر ایک کتاب کھول کر پڑھنے لگتا ہے۔ اب شمس کافی کی پیالی لا کر اس کے پاس رکھتا ہے۔)

شمس: کافی سر۔

ڈاکٹر: تھینک یو شمس

(شمس لمحہ بھر کے لئے اس کے ہاتھ میں تھامی ہوئی کتاب دیکھتا ہے۔) ------ کٹ

سین 12 آوٹ ڈور دن

(کار میں ڈاکٹر محبوب کلینک کی طرف جا رہا ہے۔ ریگل یا انار کلی کے چوراہے پر جب لال بتی آتی ہے تو وہ کار کو روکتا ہے۔ اس وقت فٹ پاتھ سے کراسنگ پر ایک فقیر کراس کرنے کے لئے اترتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا ڈنڈا ہے جس پر گھنگھرو بندھے ہیں۔ جب وہ ڈاکٹر کی گاڑی کے پاس آتا ہے تو ڈاکٹر کی سیٹ کے پاس آکر رکتا ہے۔)

ڈاکٹر: بابا جی معاف کریں۔ آج میرے پاس چینج نہیں ہے۔

فقیر: مانگنے کون آیا ہے بابا لوگ۔ ہم تو دینے والے ہیں۔ مانگنے والے نہیں

ڈاکٹر: کراس کر جائیں بابا جی۔ بتی بدلنے والی ہے۔

فقیر: (ایک روپیہ کا نوٹ اسے دے کر) لے روپیہ..... پکڑ لے..... لے لے ورناں..... آج ہمارا دل تم پر راضی ہو گیا ہے۔ لے لے.......

(ڈاکٹر حیران ہو کر نوٹ دیکھتا ہے۔ فقیر ڈنڈے کے گھنگھرو کھڑکاتا زیبرا کراسنگ سے فٹ پاتھ پر جاتا ہے۔ بتی بدلتی ہے۔ ڈاکٹر حیران ایک ہاتھ میں نوٹ پکڑے کار چلاتا ہے۔ اس پر فقیر کے گھنگھروں کی آواز سپرامپوز ہوتی ہے۔) ------ کٹ

سین 13 ان ڈور شام

(کالج میں چھوٹا سا وزیٹرز روم ------- اس وقت مس زاہدہ اور ڈاکٹر محبوب اس کمرے میں بیٹھے ہیں۔ ایک کونے میں فون بھی پڑا ہے۔)

زاہدہ: ویسے مجھے بڑی خوشی ہے ڈاکٹر صاحب ------ لیکن میں حیران ہوں آپ کو خیال کیسے آیا۔

ڈاکٹر: گھر جا رہا تھا واپس ------ آپ کے کالج کے سامنے سے گزرا تو خیال آیا کہ آپ کی طبیعت پوچھ لوں۔ بس اتنی سی بات تھی۔

زاہدہ: مجھے یقین نہیں آتا کہ کوئی مجھے بھی ملنے آیا ہے۔

ڈاکٹر: کیوں آپ کے وزیٹرز نہیں آتے۔

زاہدہ: میل وزیٹرز نہیں آتے ------ عورتیں آتی ہیں۔ انہیں میں اپنے کمرے میں لے جاتی ہوں۔

ڈاکٹر: بھائی وغیرہ؟

زاہدہ: ایک بھائی ہے۔ وہ سرگودھا میں رہتا ہے۔ ماموں لندن میں ہیں۔ باقی سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہیں۔ ایک فضول پروفیسنی سے کون ملنے آتا ہے۔ ٹائم ویسٹ کرنے ------

(دکھی ہو جاتی ہے) کس کو پڑی ہے؟

ڈاکٹر: ہم تو سمجھتے ہیں کہ پروفیسر لوگ خود کسی سے ملنا نہیں چاہتے۔ ان کی دماغی سطح ہی اتنی بلند ہوتی ہے کہ کسی سے بات کرنا پسند نہیں کرتے۔

زاہدہ: (ہنس کر) ہاں جی ایسے ہی ہمیں سوسائٹی سے توڑے رکھیں۔ ہمارا ہوا بنا کر۔

ڈاکٹر: چھٹیوں میں آپ سرگودھا وغیرہ بھی جاتی ہوں گی۔

زاہدہ: (لمبی سانس بھر کر) بس ڈاکٹر صاحب --- کہیں چلی جاؤں۔ کسی کے پاس چلی جاؤں... تنہائی ساتھ جاتی ہے... پڑھانا بھی بڑا ہی difficult job ہے۔ سارا وقت اپنے شاگردوں سے اونچا رہنا پڑتا ہے ------ چھٹی کے وقت ہم خود اس قابل نہیں رہتے کہ کسی سے مکس کر سکیں۔ دماغ خالی ہو چکا ہوتا ہے۔

ڈاکٹر: آپ اتنی مایوسی کی باتیں کیوں کرتی ہیں زاہدہ؟

زاہدہ: (لمبے وقفے کے بعد) آپ نے مجھے زاہدہ کہا ڈاکٹر صاحب!

ڈاکٹر: آپ کو کوئی اعتراض ہے؟

زاہدہ: نہیں نہیں نہیں نہیں۔ مجھے تو بڑی خوشی ملی ہے ڈاکٹر صاحب ----- اس طرح جیسے آپ نے لیا ہے نام --- ایسے تو اب کوئی بھی میرا نام نہیں لیتا۔ اپنائیت کے ساتھ۔

ڈاکٹر: (ذرا سا گھبرا کر جیسے موضوع بدلنا چاہتا ہو) میں آپ کو ایک میڈیکل مشورہ دینے آیا تھا۔

زاہدہ: جی ڈاکٹر صاحب

ڈاکٹر: کئی cases میں ہم صرف آب و ہوا کی تبدیلی ریکمنڈ کرتے ہیں۔ گرد و پیش کی تبدیلی..... ماحول کی تبدیلی..... دراصل جس سردرد کا ذکر آپ کر رہی ہیں..... کبھی کبھی یہ ایک روٹین کی پابندی سے بھی ہوتا ہے۔ روزمرہ ایک ہی ڈگر پر چلتے رہنے سے اور.......

(اس وقت فون کی گھنٹی بجنے لگتی ہے' زاہدہ فون کا چونگا اٹھا کر نیچے رکھ دیتی ہے اور خود رونے لگتی ہے۔)

زاہدہ: لیکن میں اس تبدیلی کی تلاش میں کہاں جاؤں ڈاکٹر صاحب۔

ڈاکٹر: کچھ دیر کے لئے اپنے عزیزوں رشتہ داروں کے پاس۔ دوستوں کے پاس۔

زاہدہ: میری بھابی پہلے ہی مشکل سے اماں کو برداشت کرتی ہیں..... میں بھی ان پر بوجھ ڈال دوں۔ اپنا اور اپنی سردرد کا..... دراصل..... دراصل ڈاکٹر صاحب باپ فوت ہو جائے تو پھر کوئی جگہ نہیں رہتی..... کوئی گھر باقی نہیں رہتا..... جانے کے لئے..... اپنا آپ چھپانے کے لئے....

ڈاکٹر: آئی ایم سوری مس رفیق۔

زاہدہ: زاہدہ......

ڈاکٹر: جی زاہدہ......

زاہدہ: کچھ نہیں ہو سکتا ڈاکٹر صاحب۔ کچھ نہیں ہو سکتا..... بالآخر میری شریان پھٹے گی۔ ہرج ہوگا اور ختم!

ڈاکٹر: آپ..... اور کچھ نہیں تو کچھ نئے دوست..... نئی واقفیت-----

زاہدہ: کیسے..... کیسے؟ کون؟ کہاں؟

ڈاکٹر: میں آپ کے ماحول میں نئی چیز ہو سکتا ہوں..... نیا آدمی نیا دوست

زاہدہ: (حیرانی اور خوشی کے ساتھ) آپ؟ آپ ڈاکٹر صاحب؟

------کٹ

سین 14 ان ڈور رات

(ڈاکٹر صاحب اور بیگم صاحب اپنے بیڈ روم میں الگ الگ پلنگ پر سوئے ہیں۔ عقب میں رات کے پہرے دار پولیس مین کی سیٹی سنائی دیتی ہے۔ کچھ لمحوں بعد ڈاکٹر صاحب کی آنکھ کھلتی ہے۔ وہ جیسے سیٹی کی آواز پر اٹھے ہوں۔ یکدم اٹھ کر وہ اپنے گلے پر ہاتھ رکھتا ہے جیسے اس کا سانس رک گیا ہو۔ پھر وہ اٹھتا ہے اور تپائی پر رکھے ہوئے جگ سے پانی گلاس میں ڈالتا ہے۔ آہستہ سے آواز دیتا ہے۔ "رضیہ"۔ اس کی بیگم بے سدھ سوئی ہوئی ہے۔ اس کی ڈری ہوئی آواز نہیں سنتی۔ سیٹی پھر بجتی ہے وہ کھڑکی تک جاتا ہے۔ کھڑکی کھول کر غور سے باہر دیکھتا ہے۔ عقب میں سیٹی پھر بجتی ہے۔ وہ خوفزدہ ہے۔ کھڑکی بند کرتا ہے اور واپس آ کر لیٹتا ہے۔ پھر رضیہ کو آواز دیتا ہے۔ اب رضیہ کروٹ لیتی ہے۔

رضیہ کے پلنگ میں اس کے ساتھ اس کا پوتا سو رہا ہے۔ اس کے پلنگ پر رضائی کے اوپر جابجا زمینوں کے نقشے' مکانوں کے نقشے بکھرے پڑے ہیں۔ کیمرہ ان کا کلوز اپ دکھاتا ہے۔ سوتے میں رضیہ کا ایک ہاتھ اپنے پوتے پر ہے اور دوسرا زمین کے نقشے پر پڑا ہے۔ گھر میں کہیں فاصلے پہ گھڑی کی ٹن ٹن بارہ بجاتی ہے۔ اچانک کھڑکی کھل جاتی ہے۔ ڈاکٹر اس کی طرف پھر دیکھتا ہے دور کہیں سپاہی سیٹی بجا رہا ہے۔ سیٹی پر مس زاہدہ کی سسکیاں ------ فیڈ ان ہوتی ہیں۔) ------کٹ

سین 15 ان ڈور صبح کا وقت

(ایک ہوٹل صبح تقریباً دس بجے کا وقت جب ہوٹلوں میں بالکل رش نہیں ہوتا۔ ساری میزیں خالی ہیں۔ صرف ایک کونے میں ڈاکٹر صاحب اور زاہدہ بیٹھے کافی پی رہے ہیں۔ زاہدہ چھوٹے سے رومال سے آنسو پونچھتی ہے)

زاہدہ: ایک تو میری پرنسپل کا دماغ خراب ہے۔ اس کے گھر میں اتنے پرابلمز ہیں' اتنے پرابلمز ہیں کہ سب کا نزلہ مجھ پر پڑتا ہے۔ اب میں کیا کروں۔ اگر اس کا ہزبینڈ دوسری شادی کرنا چاہتا ہے یہ بھی میرا قصور ہے ---- بتایئے؟

ڈاکٹر: (محبت سے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر) ساری باتوں کو خاص کر ملازمت کی مشکلات کو اتنی سنجیدگی سے نہیں لیا کرتے....

زاہدہ: کیسے نہ لوں ڈاکٹر صاحب..... میرے پاس اس جوب کے علاوہ اور کونسی پرمیننٹ چیز ہے؟ فٹ بال کے کورٹ میں سفیدی نہیں ہوئی وارڈن کو بلاؤ ------ یونین کی لڑکیاں کچھ ڈیمانڈ کر دیں وارڈن کو بلاؤ..... وزیٹرز

misbehave کریں وارڈن کو بلاؤ ...... چپڑاسی، چوکیدار ...... مالی سب وارڈن کی headache ..... اس کے علاوہ ہفتے میں پانچ پیریڈ کیمسٹری کے ..... پانچ ڈاکٹر صاحب۔ پورے پانچ۔

ڈاکٹر: آپ وارڈن شپ چھوڑ دیں۔

زاہدہ: کیسے چھوڑ دوں ڈاکٹر صاحب ..... اس کا الاؤنس بھی ملتا ہے کچھ ..... اور پھر رہائش فری ہے۔ یہ بھی تو سوچنا پڑتا ہے ہم ورکنگ ویمن کو ..... چھوڑ تو دوں وارڈن شپ لیکن پھر جاؤں کہاں۔ آپ کو کیا معلوم ہم لوگوں کی مشکلات۔ آپ عیش سے گزاریں اپنی زندگی ......

ڈاکٹر: (حیرانی کے ساتھ) عیش کے ساتھ ...... یہ تم سے کس نے کہا کہ میں عیش کی زندگی گزار رہا ہوں۔

زاہدہ: اتنا اچھا اعلیٰ جوب ہے آپ کا ———— بچے سیٹل ہو گئے ہیں۔ سمجھدار عقل مند بیوی ہے ——— محبت کرنے والی۔

ڈاکٹر: (لمبی آہ بھر کر) ہاں ——— شاید یہی کچھ ہے۔

زاہدہ: آپ کو کیا پتہ محرومی کیا ہوتی ہے I was barely twenty-one ڈاکٹر صاحب جب میں نے ملتان جا کر سروس جوائن کی ... کہاں لاہور کہاں ملتان ... پہلی بار اکیلے سفر کیا ..... سارا راستہ ڈرتی رہی ..... کہیں کوئی اغوا نہ کر لے ..... کہیں کوئی سامان نہ کھسکا لے ..... ہوسٹل میں جگہ نہ ملی ... لڑکیوں کے ساتھ رہنا پڑا پورے پندرہ دن .....

ڈاکٹر: تم یہ ساری bitterness ———— یہ سارے پچھلے واقعات بھول نہیں سکتیں زاہدہ۔

زاہدہ: ربڑ سے پنسل کا لکھا مٹ سکتا ہے ڈاکٹر صاحب لیکن آنسوؤں سے پچھلے واقعات اور بھی واضح ہو جاتے ہیں۔ جیسے ونڈ سکرین دھل جائے تو اور بھی صاف نظر آنے لگتا ہے۔

ڈاکٹر: کافی پیو زاہدہ۔ ٹھنڈی ہو گئی ہے۔

زاہدہ: کیا پینی ہے کافی ہم نے ڈاکٹر صاحب ..... آپ تو کسی دن اپنے نسخے میں سکھیا لکھ دیں۔ سائنائیڈ تجویز کر دیں تو ———— کام بن جائے گا ہمارا .....

ڈاکٹر: اس قدر مایوسی ..... اسقدر مایوسی

زاہدہ: انسان کسی نہ کسی چیز کے لئے زندہ ہوتا ہے ڈاکٹر صاحب ——— کسی شخص کے لئے ..... کسی belonging کے لئے۔ کسی کام کے لئے ...... کسی آئیڈیا کے لئے ..... میں کس لئے زندہ ہوں ...... کیوں زندہ ہوں۔ ڈاکٹر صاحب بتائیے ناں۔

(اس وقت اس کے چہرے کا کلوز اپ آتا ہے۔ آنسو صرف بائیں آنکھ سے گرتے ہیں۔) ———— کٹ

سین 16 ان ڈور دن

(ڈاکٹر محبوب کلینک میں کرسی پر گہرے خیال میں غرق ہے۔ چہرے پر غم کے آثار ہیں۔ وہ جیسے کوئی مسئلہ دل ہی دل میں سلجھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ نرس آتی ہے۔)

نرس: ڈاکٹر صاحب مسز فاروق آئی ہیں۔ وہ کہہ رہی ہیں انہیں جلدی ہے۔

ڈاکٹر: بس ابھی ———— چند لمحوں میں۔

(نرس جاتی ہے۔ اٹھ کر ایکسرے دیکھنے والی مشین پر ایکسرے فٹ کرتا ہے۔ یکدم اس پر زاہدہ کی شکل آتی ہے۔ ساتھ ہی یہ الفاظ فیڈ ان ہوتے ہیں۔)

زاہدہ: جن کا ——— باپ نہ ہو ان کا کوئی گھر نہیں ہوتا ڈاکٹر صاحب۔

(یہ کٹ پچھلے شاٹ سے لگائے۔ فون کی گھنٹی بجتی ہے جا کر اٹھاتا ہے۔)

ڈاکٹر: جی بول رہا ہوں ——— جی ..... نہیں رانگ نمبر نہیں ہے۔ محبوب کلینک ہے ——— ٹھیک ہے ..... جی بیگم صاحب آپ نے ضرور دوبار فون کیا ہوگا۔ لیکن میں موجود نہیں تھا ..... جی؟ ———— جی آج میں مصروف ہوں ..... نہیں آف ڈے نہیں ہے لیکن جتنے مریض ہیں میں صرف انہی کو دیکھوں گا۔ اور پھر چلا جاؤں گا ...... جی نہیں آج کلینک شام کو بند ہوگا ———— جی ———— ؟ جی نہیں کوئی بات نہیں ———— خدا حافظ .....

نرس: (اندر آتی ہے) ڈاکٹر صاحب پیشنٹ بھیجوں؟

ڈاکٹر: ذرا صبر سسٹر۔ میں بھی ہیومن بینگ ہوں ———— کبھی کبھی مجھے بھی مارجن دے دیا کریں۔ پلیز۔

نرس: نہ بھیجوں سر؟

ڈاکٹر: دس منٹ بعد سسٹر پلیز۔

نرس: (حیرانی سے) اچھا جی

(چلی جاتی ہے۔ ڈاکٹر اپنا سر کرسی کی پشت سے لگاتا ہے۔ پھر رومال میں زور سے ناک صاف کرتا ہے۔ پھر سر پشت سے لگاتا ہے۔ آنکھیں بند کرتا ہے۔ فون کی گھنٹی بجتی ہے وہ فون اٹھا کر رکھ دیتا ہے۔ اب جیسے اس کے ذہن کی آواز گونجتی ہے۔)

زاہدہ کی آواز: انسان کسی نہ کسی چیز کے لئے زندہ ہوتا ہے ..... کسی شخص کے لئے ..... کسی کام کے لئے .... کسی belonging کے لئے ..... میں کس کے لئے زندہ رہوں ..... کس لئے ..... ———— کٹ

سین 17 آؤٹ ڈور دن کا وقت

(لو کی ہیڈ ورکس میں ریت پر زاہدہ اور ڈاکٹر صاحب دور سے چلتے آرہے

ہیں۔ اس سین پر بیک گراؤنڈ میں "لنگھ آجا تَن چناں" کا میوزک لگوایئے۔ کٹ کر کے دوایک جگہ پر زاہدہ اور ڈاکٹر صاحب کو اس سازینہ پر گھومتے پھرتے دکھاتے ہیں۔ پھر ڈاکٹر صاحب تمام تر پانی سے میں بھیگے ہوئے ہیں اور پانی میں کھڑے ہیں۔ زاہدہ ان کو زور لگا کر بازو سے کھینچ کر ساحل پر لاتی ہے۔ زاہدہ کے بھی تمام کپڑے بھیگے ہوئے ہیں اور ڈاکٹر صاحب بھی سر سے پاؤں تک پانی میں شرابور ہیں۔ وہ ریت پر آکر بیٹھتے ہیں۔ زاہدہ ان کے گیلے سویٹر اور کوٹ کو اتارنے میں مدد دیتی ہے)

زاہدہ: جب آپ کو تیرنا نہیں آتا تو آپ پانی میں کیوں گئے۔

ڈاکٹر: کوئی چیز تھی پانی میں۔ چمکدار..... سی....

زاہدہ: ہر چمکدار چیز کے لئے آپ پانی میں کود جائیں گے......

ڈاکٹر: چمک چمک میں فرق ہوتا ہے زاہدہ ------- یہ اور قسم کی چمک تھی۔

زاہدہ: اگر میں آپ کو نہ بچاتی تو ریلا تو آپ کو لے جاتا کہیں کا کہیں......

ڈاکٹر: واقعی اگر تم مجھے کھینچ کر دوبارہ ساحل پر نہ لاتیں زاہدہ...... تو میں اس پر سکوت ریلے میں بہہ کر اب تک بہت دور نکل گیا ہوتا۔

زاہدہ: (ریت پر بیٹھتی ہے ڈاکٹر صاحب اپنا سر اس کے زانو پر رکھتے ہیں۔ زاہدہ دوپٹے سے ان کا سر سکھاتی ہے۔) میں اچھی ہوں ناں ڈاکٹر صاحب!

ڈاکٹر: بہت۔

زاہدہ: آپ کا نقصان تو نہیں ہوا------- مجھ سے مل کر؟

ڈاکٹر: نفع ہی نفع...... دونوں جہانوں کا نفع.....

زاہدہ: دل سے کہیں۔

ڈاکٹر: اچھا آج سٹیتھسکوپ میں اس کی آواز سن لینا۔

(اس وقت آسمان پر کوئی پرندہ اڑتا جاتا ہے ڈاکٹر اوپر نگاہ کرتا ہے پرندے کی سیٹی نیڈان ہوتی ہے۔)

زاہدہ: اوپر کیا دیکھ رہے ہیں۔ میری طرف دیکھیں۔

ڈاکٹر: ہاں ------ اوپر کچھ نہیں ہے ------- سب کچھ یہاں ہے یہاں ......اس زمین کے ٹکڑے پر۔ اس ریتلے کنارے پر! -------کٹ

سین 18 اِن ڈور رات

(کھانے کا کمرہ۔ سارا خاندان کھانے کی میز کے گرد جمع ہے جیسے پہلے تھا۔ اب ڈاکٹر صاحب اس خاندان میں اس طرح ملے ہوئے نہیں ہیں، جیسے پہلے سین میں تھے۔ انہیں اس ماحول کی کوئی چیز اب پسند نہیں۔ وہ اب چھوٹی چھوٹی بات پر چبھتی باتیں کہتے ہیں۔ ان کی کرسی کے پیچھے شمس چپ چاپ کھڑا ہے۔)

ڈاکٹر: (ٹی کوزی اٹھا کر دیکھتا ہے۔ الٹ پلٹ کرتا ہے) عجیب ٹی کوزی ہے!

------- مری ہوئی مرغی سی۔ کوئی اور نہیں ہے۔

رضیہ: آپ ہی لائے تھے ڈاکٹر صاحب۔

ڈاکٹر: میں ایسی بیہودہ ٹی کوزی کبھی نہیں خرید سکتا۔ یہ میرا taste نہیں ہے۔

مریم: ابو آپ ہی لائے تھے۔ آپ کو یاد نہیں رہا۔

ڈاکٹر: تمہاری امی ساتھ ہوں گی۔ انہوں نے مجھے فورس کیا ہو گا خریدنے پر۔

رضیہ: کمال ہے!

ڈاکٹر: (چائے کے گھونٹ کو پی کر) ایکسکیوزی شمس ------- یہ چائے نہیں پک سکتی ہمارے گھر میں کبھی؟

لبنیٰ: آپ چائے ہی تو پی رہے ہیں ابو جی۔

ڈاکٹر: (طنز سے) میں سمجھا بخشش ہے۔ چائے تو غالباً گرم ہوتی ہے۔ عام طور پر------

شمس: کافی سر؟

ڈاکٹر: نو تھینک یو...... (چڑ کے ساتھ۔ شمس مودب طریقے سے پیچھے کھڑا ہو جاتا ہے۔) میاں اطہر صاحب تمہاری انجینئری ہمارے کس کام آئے گی اور کس دن آئے گی؟

اطہر: کیوں ابو جی؟

ڈاکٹر: آپ کی مصروفیات بہت ہیں۔ ہماری عرض پر آپ کب توجہ دے سکتے ہیں (چبا چبا کر) چھوٹے لوگوں کی عرضی پر۔

اطہر: آپ حکم کریں ابو۔

لبنیٰ: کمال ہے آپ ابو کی بات بھی بھول جاتے ہیں۔

ڈاکٹر: میں نے اس سے کہا تھا لبنیٰ کہ اوپر ٹیلی ویژن کا انٹینا ہل گیا ہے آندھی میں۔ اسے ٹھیک کرنا ہے لیکن یہ سب ٹیلی ویژن ضرور دیکھیں گے لیکن انٹینا نہیں فٹ کر سکیں گے مضبوطی کے ساتھ!

اطہر: ابو جی اس کے لئے نیا ڈنڈا لانا پڑے گا۔ بانس بازار سے۔

ڈاکٹر: تو لایئے ------ یا میں کلینک کے بعد وہاں بلّس بھی خریدنے جاؤں اور کندھے پر رکھ کر لاؤں اپنے۔

(سب چپ ہو جاتے ہیں۔)

ڈاکٹر: (کھانس کر) آج عنایت صاحب کلینک پر آئے تھے رضیہ۔

رضیہ: اچھا----- کیا حال ہے ان کا۔ کئی برسوں سے گھر نہیں آئے۔

ڈاکٹر: ان کی دوسری بیوی ساتھ تھی ان کے۔

رضیہ: دوسری بیوی؟ ----- لیکن ان کی تو پہلی بیوی زندہ ہے ----- ہے

ہے؟

ڈاکٹر: ہاں زندہ ہے۔ very much alive

لبنیٰ: امی جی وہی عنایت صاحب نہیں جو ہمیں عارف کی شادی پر ملے تھے؟

رضیہ: ہاں وہی ------

لبنیٰ: لیکن ---- وہ تو ابو جی سے بھی بڑے ہیں۔

ڈاکٹر: تو کیا بڑا آدمی شادی نہیں کر سکتا۔ کوئی پابندی ہے۔

رضیہ: (حیران ہو کر) لیکن ڈاکٹر صاحب اس عمر میں ضرورت کیا ہے۔ جوان بچے ہیں اچھی بھلی بیوی ہے۔

ڈاکٹر: اس کی کوئی ضرورت ہوگی ناں رضیہ بیگم ---- ہم کیسے بتا سکتے ہیں۔

لبنیٰ: اس عمر میں کون سی ضرورتیں رہ جاتی ہیں ابو جی۔

ڈاکٹر: (غصے کے ساتھ) ہو بیگم ضرور کچھ ضرورتیں رہ جاتی ہوں گی ورنہ کیوں کرتے لوگ دوسری شادی۔ کچھ خلا ہوتا ہوگا ان کی زندگیوں میں۔

رضیہ: بچے نہ ہو تو اور بات ہے ڈاکٹر صاحب لیکن .....

ڈاکٹر: لیکن کیا؟ لیکن کیا ------- یہ تم عورتیں مرد کو اپنی مونوپلی کیوں سمجھتی ہو؟ تم یہ کیوں سمجھتی ہو کہ یہ بھی ایک کتا ہے۔ چاہے رسی سے باندھو چاہے کھلا چھوڑ دو اسے ہر حال میں گھر کے پھاٹک کے سامنے فرش پر تھوتھنی رکھ کر عمر گزارنی چاہیے ....

رضیہ: خیر یہ بات تو نہیں ہے ڈاکٹر صاحب۔

ڈاکٹر: شادی کرنی چاہیے مردوں کو ...... ایک چھوڑ دو ...... دو چھوڑ چار ..... عورتوں کو قدر رہتی ہے مردوں کی ..... ان کے وجود کی ضرورت رہتی ہے۔

رضیہ: یہ آپ کے خیالات کو کیا ہو گیا؟ عنایت صاحب سے ملنے کے بعد۔

ڈاکٹر: میرے خیالات کو کچھ نہیں ہوا .... تم ہی لکیر کی فقیر ہو ..... کیا ہوا جو عنایت صاحب نے دوسری شادی کر لی ..... کوئی قباحت نہیں۔ بڑے یار آدمی ہیں۔ بڑے صوفی آدمی ہیں۔ میں تو ان کا دل سے قدر دان ہوں ------ فریش سٹارٹ لیا ہے انہوں نے پچپن برس کی عمر میں .... نئی دوڑ میں شریک ہو گئے ہیں۔ نئی زندگی کی lease ملی ہے انہیں .... اب وہ تیس سال اور خوشی سے زندہ رہ سکتے ہیں۔

(رضیہ یکدم رونے لگتی ہے اور میز سے اٹھ کر جاتی ہے۔)

لبنیٰ: (پیچھے اٹھتے ہوئے) امی ..... امی جی .... امی جی سنئے۔

اشعر: ابو جی ------ آپ کو امی کا خیال رکھنا چاہیے پہلے ہی ان کا بلڈ پریشر ہائی ہے۔ (اٹھتا ہے)

ڈاکٹر: جی ہاں اشعر صاحب۔ ایک صرف تمہاری امی کا بلڈ پریشر ہائی ہے۔ ایک صرف اسی کو توجہ کی ضرورت ہے۔ صرف وہ matter کرتی ہے اس گھر میں ..... اس کے پیروں تلے جنت جو ہوئی ......

(اشعر میز پر بددلی سے پیپر ویٹ رکھ کر ماں کے پیچھے جاتا ہے۔)

ڈاکٹر: تم دونوں کیوں بیٹھے ہو -------- تم بھی جاؤ .... جاؤ ماں کی دلجوئی کرو ...... لیکن سن لو اطہر تم اور مریم تم بھی۔ دوسری شادی کوئی گناہ نہیں ہے کسی کی حق تلفی نہیں ہوتی اس سے کوئی مارا نہیں جاتا ..... خواہ مخواہ نہ کوئی بات نہ ثبات اور aggressive ہو جاتے ہیں۔

(اطہر اور مریم بھی اٹھ کر چلے جاتے ہیں ----- ڈاکٹر اب محسوس کرتا ہے کہ اس نے یہ سین خواہ مخواہ کھڑا کیا وہ رومال نکال کر زور سے اس میں ناک صاف کرتا ہے اور پھر چائے پینے لگتا ہے۔ یکدم پیچھے سے شمس کافی کی پیالی رکھتا ہے۔)

شمس: کافی سر!

ڈاکٹر: تھینک یو ------ تھینک یو شمس۔ ------ کٹ

سین 19 آؤٹ ڈور شام

(پچھلے سینوں میں زاہدہ خود ترسی کا شکار رہی ہے۔ وہ ایسی باتیں کرتی رہی ہے جس سے وہ ڈاکٹر محبوب میں ہمدردی کا جذبہ پیدا کر سکے۔ اس آؤٹ ڈور میں ڈاکٹر محبوب، زاہدہ کو اپنی مجبوریوں کا رونا رو کر متاثر کرتا ہے۔

یہ آؤٹ ڈور پی ڈبلیو آر کے گولف کلب میں فلمائی جائے۔ پہلے ڈاکٹر اور زاہدہ سوئمنگ پول کے کنارے بیٹھے ہیں۔ پھر وہ گولف کی گراؤنڈ میں پھرتے ہیں۔ ایک لڑکا کچھ فاصلہ پر ڈاکٹر صاحب کی گولف کا سامان کندھے پر اٹھا کر ساتھ چل رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ میں گولف کی سٹک ہے۔

اس آؤٹ ڈور میں جو ڈایلاگ ہیں، ان کو علیحدہ سٹوڈیو میں ریکارڈ کیجئے اور اس آؤٹ ڈور میں جو زیادہ لانگ شاٹ ہیں ان پر سپرامپوز کیجئے)

ڈاکٹر: میں ساری زندگی تنہائی کا شکار رہا ہوں زاہدہ۔ میرا کوئی دوست ...... کوئی رشتہ دار مجھے کبھی سمجھ نہیں سکا ...... رضیہ ایک اور فریکوئنسی کی عورت ہے ...... میں یہ نہیں کہتا وہ خراب ہے ------ یا اس میں کوئی برائی ہے ...... لیکن وہ اپنے محور پر چلتی ہے ...... اس کے بچے اس کے محبوب ہیں ...... ڈاکٹر محبوب اس کا کچھ نہیں ہے ...... میں ساری عمر اس کے بچوں کو پالنے کا فرض ادا کرتا رہا ہوں، اس کی ..... اس کے بچوں کی سہولت کے لئے ..... جو کچھ انہیں درکار تھا اس کی فراہمی کے لئے ..... میں خود کچھ نہیں ..... میں کوئی معنی نہیں

رکھتا زاہدہ ..... کسی کے لئے بھی ..... لیکن کبھی کبھی اپنی ذمہ داریوں سے کندھے تھک جاتے ہیں..... روح تھک جاتی ہے ...... پھر اوپر ...... اور اوپر اڑا نہیں جاتا...... پھر زمین کی طرف...... کسی گوشہ زمین کی طرف لپکنے لگتا ہے آدمی۔ تاکہ اگر اس پر گھر نہ بنا سکے زاہدہ........ تو اس میں دفن تو ہو سکے۔ سکون کے ساتھ اطمینان کے ساتھ ------ میں اب تھک گیا ہوں۔ شل ہو گیا ہوں بالکل۔ اور کوئی گوشہ عافیت ڈھونڈھ رہا ہوں۔ ----کٹ

سین 20 ان ڈور رات

(اس وقت ڈاکٹر صاحب نائیٹ گاؤن پہنے صوفے پر بیٹھے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں یوگا والی کتاب ہے جسے وہ انہماک سے پڑھ رہے ہیں۔ رضیہ پھر کپڑے تہہ کر رہی ہے اور ہینگروں میں ٹانگ رہی ہے۔)

رضیہ: ڈاکٹر صاحب آپ میری بات سن رہے ہیں؟

ڈاکٹر: (لاتعلقی کے ساتھ) جی ------ بڑی توجہ سے۔

رضیہ: آپ نے مجھ سے کوئی تفصیل نہیں پوچھی۔

ڈاکٹر: بتایئے میں سن رہا ہوں۔

رضیہ: خالہ فیروزہ کا سارا خاندان آیا ہوا تھا دوپہر کو ------ بچے وچے ------ لبنی کی ماں اور بہنیں بھی بیٹیں تھیں۔ بڑی افراتفری مچی ہوئی تھی۔ میں شمس کا ہاتھ بٹانے باورچی خانے میں چلی گئی ------ آپ سن رہے ہیں۔

ڈاکٹر: جی جی بالکل۔

رضیہ: وہ نچلے چولہے پر روسٹ کر رہا تھا۔ میں اوپر والے چولہے پر آملیٹ بنا رہی تھی۔ اوپر سے چل رہا تھا پنکھا ------ میرا دوپٹہ ہوا سے نچلے چولہے میں چلا گیا۔ بھک سے آگ لگ گئی سارے پلے کو جیسے دوپٹے میں بارود بھرا ہو۔

ڈاکٹر: (سردمہری سے) ہوں!

رضیہ: ایک سیکنڈ میں شعلہ میرے کندھے تک آیا..... وہ تو بھلا ہو شمس کا کہ اس نے لپک کر دوپٹہ کھینچ لیا..... ورنہ میں نے تو ظلیٹ کا سوٹ پہنا ہوا تھا ----سارے بدن کو آگ لگ جاتی ایک منٹ میں۔

ڈاکٹر: اچھا ہوا شمس نے آپ کو بچا لیا۔

رضیہ: ڈاکٹر صاحب

ڈاکٹر: جی؟

رضیہ: دشمن بھی ایسے موقع پر ہمدردی کا اظہار کر دیتے ہیں۔

ڈاکٹر: تو میں نے کی ہے ناں ہمدردی ---- وضو کر کے نفل نیت لوں۔

رضیہ: کیا اظہار کیا ہے آپ نے اپنی ہمدردی کا۔

ڈاکٹر: ضروری نہیں رضیہ کہ زبانی اظہار کیا جائے...... اظہار دل میں بھی ہوتا ہے۔

رضیہ: غلط ہے ڈاکٹر صاحب...... جہاں محبت ہوتی ہے وہاں اظہار ہوتا رہتا ہے بڑے واضح طریق پر۔ جب انسان محبت کرتا ہے تو وہ گونگا نہیں رہتا۔

ڈاکٹر: میں بھی تمہارے طریقے سے نہ سہی اپنے طریقے سے اظہار کرتا رہتا ہوں ------ یہ گھر، یہ آسائشیں، یہ کاریں..... یہ سب میرا اظہار ہیں.....

رضیہ: آپ کا اظہار بڑا فرض منصبی قسم کا ہے ---- فرض بھی ادا ہو گیا، اظہار بھی ہو گیا۔

ڈاکٹر: تم چاہتی کیا ہو رضیہ۔

رضیہ: (روتی ہے) میں نے کیا چاہنا ہے ڈاکٹر صاحب ------ وقت ہی کتنا رہ گیا ہے چاہنے نہ چاہنے کے لئے۔

(منہ پھیر کر ہینگر ٹانگتی ہے۔ آنسو اس کی گالوں پر گرتے ہیں۔) کٹ

سین 21 ان ڈور دن کا وقت

(ہوٹل کی میز پر زاہدہ اور محبوب دونوں بیٹھے ہیں۔)

زاہدہ: ڈاکٹر صاحب بڑے بکھیڑے ہوں گے۔ بڑی الجھنیں پیدا ہوں گی۔

ڈاکٹر: ہونے دیں۔

زاہدہ: آپ کی فیملی بہت فساد ڈالے گی۔ مجھے پتہ ہے۔

ڈاکٹر: ڈالنے دیں۔

زاہدہ: جوان بیٹے کیسے برداشت کر لیں گے کہ ان کا باپ دوسری شادی کر لے۔

ڈاکٹر: کر لیں گے برداشت۔ انہیں کیا۔ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔

زاہدہ: آپ کی وائف ڈاکٹر صاحب سوچ لیں۔ بڑی جگ ہنسائی ہو گی۔

ڈاکٹر: ہونے دیں۔

زاہدہ: آپ کی عزت ہے شہر میں۔ لوگ آپ کو پوجتے ہیں۔

ڈاکٹر: آئندہ مت پوجیں ------ مہربانی ان کی۔

زاہدہ: کیا پتہ میں بھی آپ کو وہ خوشی نہ دے سکوں جس کی آپ کو تلاش ہے۔

ڈاکٹر: یہ نہیں ہو سکتا۔

زاہدہ: کیا مطلب؟

ڈاکٹر: تم مجھے وہ خوشی ضرور دو گی جس کی مجھے تلاش ہے...... کیونکہ مجھے صرف تمہاری تلاش رہی ہے ساری عمر.....

زاہدہ: سچ ڈاکٹر صاحب......

(محبت سے اس کا ہاتھ پکڑتی ہے۔) ------کٹ

سین 22 ان ڈور رات

(ڈاکٹر محبوب اپنے صوفے پر کمبل لئے بیٹھا ہے۔ اس کے دونوں بازو سر کے پیچھے ہیں۔ شمس دبے پاؤں آتا ہے۔ کافی کی پیالی ساتھ لاتا ہے۔)

شمس: کافی سر

ڈاکٹر: تھینک یو شمس ------کٹ

سین 23 آؤٹ ڈور دن

(ڈاکٹر محبوب ائر ٹریول ایجنسی میں ٹکٹ بنوا رہے ہیں۔ کاؤنٹر کی لڑکی ڈاکٹر صاحب کو دو ٹکٹ پکڑاتی ہے۔) --------کٹ

سین 24 ان ڈور شام

(کالج کا ملاقاتیوں کا کمرہ۔ زاہدہ اس وقت رو رہی ہے۔)

ڈاکٹر: اب کیوں رو رہی ہو زاہدہ۔

زاہدہ: مجھے ڈر لگ رہا ہے ڈاکٹر صاحب...... بالکل جیسے میں نے ملتان کا سفر اکیلے کیا تھا ویسے۔

ڈاکٹر: لیکن اب تو ہم دونوں اکٹھے ہوں گے رہائی، چھٹی، آزادی ------

زاہدہ: آپ نے اپنی وائف سے کیا کہا ہے۔

ڈاکٹر: کچھ خاص نہیں...... پہلے ایک کانفرنس ہے میری ویانا میں تین دن کی، پھر میں سرجری میں ایک کورس کرنا چاہتا ہوں لندن میں ---- تین مہینے لگ جائیں گے اس کورس پر۔

زاہدہ: انہیں کہیں شبہ تو نہیں ہوا؟

ڈاکٹر: شبہ کس بات کا؟

زاہدہ: یہی کہ ہم ---- یعنی آپ --- لندن --- شا --- دی ----- کرنے جا رہے ہیں۔

ڈاکٹر: یہ کیسے ممکن ہے۔

زاہدہ: عورتوں کو پتہ چل جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب۔ ان کی چھٹی حس بڑی تیز ہوتی ہے۔

ڈاکٹر: لگتا ہے تو لگ جائے ------ پرسوں تک ہم دونوں فلائی کر جائیں گے۔ ان کو بھی چھٹی ------ ہم کو بھی چھٹی.....

زاہدہ: ماموں کو میں نے خط لکھ دیا تھا لندن۔ وہ ہمیں ائرپورٹ receive کرنے آجائیں گے۔

ڈاکٹر: اب تو سر درد نہیں ہوتا۔

زاہدہ: بالکل نہیں......

ڈاکٹر: بائیں آنکھ سے آنسو بھی نہیں نکلتے۔

زاہدہ: (ہنس کر) کسی آنکھ سے بھی نہیں۔

ڈاکٹر: اب میں چلوں زاہدہ۔

زاہدہ: ابھی سے.....

ڈاکٹر: کلینک کو بھی وائنڈ اپ کرنا ہے۔ اشرف کے سپرد کرنا ہے سارا کام ----- کیا پتہ میں لندن ہی میں رہ جاؤں۔

زاہدہ: سچ؟

ڈاکٹر: وہیں کلینک کھول لوں گا..... وہیں سیٹل ہو جاؤں گا..... نئی دھرتی نئی زندگی..... نیا موقع..... نئی خوشی۔

زاہدہ: یہ ٹکٹ آپ رکھیں گے ڈاکٹر صاحب۔

ڈاکٹر: نہیں بھئی اپنا ٹکٹ تم رکھو...... کسی نے میرے ساتھ دو ٹکٹ دیکھ لئے تو مشکل ہوگی۔

زاہدہ: ٹھیک ہے۔

ڈاکٹر: ایک گھنٹہ پہلے پہنچ جانا ائرپورٹ ------ اور بورڈنگ کارڈ لے کر اندر چلی جانا، احتیاط کے ساتھ۔ میں بعد میں آکر تمہیں جوائن کر لوں گا، ڈیپارچر لاؤنج میں (کھڑے ہو کر) اچھا خدا حافظ ------

زاہدہ: (اٹھتے ہوئے) خدا حافظ! ------کٹ

سین 25 ان ڈور رات

(رات کے کوئی گیارہ بج رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ڈائنگ کم ڈرائنگ روم میں لمبے صوفے پر بیٹھے ہیں اور ان کے سامنے تپائی پر ان کا بریف کیس کھلا رکھا ہے۔ اس میں کچھ کاغذات، کچھ دوائیاں اور ان کا لٹریچر اور ایک پیپر بیک کتاب رکھی ہے۔ عینک، چھوٹا کیمرہ وغیرہ بھی رکھا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب دونوں ٹانگیں صوفے پر دراز کئے ان پر کمبل ڈالے آرام کے ساتھ ڈھو لگائے پڑے ہیں۔ ان کے چہرے پر بے چینی کے آثار نمایاں ہیں ------ اتنے میں شمس اندر آتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک صوفہ گدی ہے۔ وہ آگے بڑھ کر ڈاکٹر صاحب کی کمر کے پیچھے لگاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب "تھینک یو" کہتے ہیں۔ شمس چلا جاتا ہے اور ڈاکٹر صاحب اسی طرح دبدھا میں رہ جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد شمس پھر آتا ہے اس کے ہاتھ میں کافی کی پیالی ہے۔ وہ قریب آکر کہتا ہے:)

شمس: کافی ڈاکٹر صاحب۔

ڈاکٹر: تھینک یو

(شمس بریف کیس والی تپائی ان کے قریب کر دیتا ہے جس پر ڈاکٹر صاحب اپنی کافی کی پیالی رکھ دیتے ہیں۔ شمس کھڑا ہے۔)

شمس: کل صبح کتنے بجے کی فلائیٹ سے جائیں گے سر؟

ڈاکٹر: کل صبح آٹھ بجے شمس۔ لیکن میں تو سات بجے ہی گھر سے روانہ ہو جاؤں گا۔

(شمس ان کے پاس قالین پر بیٹھ کر جیب سے رومال نکالتا ہے اور ڈاکٹر صاحب کے سوفٹی سلیپر صاف کرنے لگتا ہے۔)

ڈاکٹر: رہنے دو شمس۔ میں یہ سلیپر ساتھ نہیں لے جا رہا۔

شمس: کوئی بات نہیں سر ------ سلیپر صاف ہی اچھے رہتے ہیں۔

(وقفہ۔ خاموشی)

شمس: ڈاکٹر صاحب آپ لیٹ جایئے تھوڑی دیر کے لئے۔

ڈاکٹر: پتہ نہیں کیا بات ہے شمس۔ میں ہمیشہ سفر سے پہلے تھوڑا سا نروس ہو جاتا ہوں.....

شمس: جی سر بالکل فطری بات ہے..... پرانے رابطے ٹوٹتے ہیں' نئے بنتے ہیں۔ دونوں حالات میں کچھ نہ کچھ تکلیف تو ہوتی ہے ڈاکٹر صاحب.....

(چپ ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر اس کو حیرت سے دیکھتا ہے۔ دونوں کے کٹ)

شمس: یہ مرد عورت کا رابطہ ڈاکٹر صاحب..... یہ ہمیشہ تکلیف کا باعث ہوتا ہے..... تخلیق کا رابطہ جو ہوا..... تخلیق میں درد تو ہوتا ہی ہے..... آپ تو ڈاکٹر ہیں مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔

ڈاکٹر: لیکن ------!

شمس: تین رشتے ازلی ابدی ہیں ڈاکٹر صاحب..... خدا کا مرد سے رشتہ..... مرد کا عورت سے رشتہ..... اور عورت کا اپنی تخلیق' بچے سے رشتہ.....

ڈاکٹر: آپ اوپر بیٹھ جائیں شمس پلیز۔

شمس: میں یہیں ٹھیک ہوں سر شکریہ ------ جس وقت خدا نے مرد کا گیلا پتلا بنا کر اس میں اپنی روح پھونکی ------ اور اس کا نام آدم رکھا تو اسے فرشتوں سے سجدہ کروایا..... خدا کو اپنی تخلیق سے ویسا ہی پیار ہے جیسے مصور کو اپنی تصویر سے ہوتا ہے۔ شاعر کو اپنی نظم سے..... گلوکار کو اپنے سُر سے۔ پھر مرد کی پسلی سے عورت نے جنم لیا..... عورت مرد کی تخلیق ٹھہری' اور مرد نے عورت سے ایسے ہی محبت کی جیسے ہر خالق اپنی تخلیق سے کرتا ہے..... جس قدر محبت خدا آدمی سے کرتا ہے' ایسے ہی مرد عورت سے پیار کرتا ہے۔

ڈاکٹر: شمس صاحب آپ کون ہیں.......؟

شمس: پھر تیسرا رشتہ پیدا ہوا سر! عورت نے بچے کو جنم دیا اور بچہ اس کی تخلیق بن گیا..... یہ ایک گول چکر ہے ڈاکٹر صاحب۔ خدا..... مرد..... عورت بچہ..... لیکن تعاقب کا یہ چکر ایک ہی طرف گھومتا ہے..... الٹا کبھی نہیں چلتا۔ چلنے لگے تو کائنات بدل جاتی ہے۔ بچہ ماں کو پہچان لے تو اس کی عاقبت سنور جاتی ہے۔ عورت مرد کا جزو بن جائے تو امر ہو جاتی ہے اور مرد خدا کا عرفان حاصل کر لے تو ہمیشہ کے لئے آزاد ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ عام طور پر ہوتا نہیں..... ہر خالق کی آرزو ہوتی ہے ڈاکٹر صاحب کہ تخلیق اس کا جزو بن کر رہے..... عورت یہ برداشت نہیں کرتی کہ کوئی بھی اس کے اور اس کے بچے کے درمیان حائل ہو..... اسی طرح مرد بھی عورت کے لئے بیقرار رہتا ہے۔ وہ اپنی تخلیق پر کبھی شعر لکھتا ہے کبھی اس کی تصویریں بناتا ہے۔ کبھی اس پر قبضہ جماتا ہے۔ کبھی قتل ہوتا ہے۔ کبھی قتل کرتا ہے۔ کبھی روزگار کا رسہ کھینچتے اور مشقت کے بوکے نکالتے نکالتے جان دے دیتا ہے..... کبھی صرف ایک آہ بھر کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جاتا ہے -----

ڈاکٹر: تم کون ہو شمس؟ کون ہو.....؟ کون ہو تم.....؟ ------ کٹ

سین 26 اِن ڈور رات کا وقت

(مس زاہدہ رفیق کا کمرہ۔ اس وقت وہ اپنا سامان پیک کرنے میں مشغول ہے۔ اس کا ٹیپ ریکارڈر چل رہا ہے۔ جس پر Carpenter کا یہ گانا لگا ہوا ہے:) It'sgoingtotakesometime,thistime..

______ کٹ

سین 27 اِن ڈور رات

(واپس ڈاکٹر صاحب اور شمس کے پاس:)

شمس: جس طرح مرد عورت سے پیار کرتا ہے ڈاکٹر صاحب اور عورت بچے سے محبت کرتی ہے' ایسے بلکہ اس سے بہت زیادہ اللہ مرد سے پیار کرتا ہے..... اس کو اپنا جزو بنانے کے لئے کبھی رسول بھیجتا ہے۔ کبھی اس کے نام صحیفے ارسال کرتا ہے..... کبھی اس پر عنایات کی بوچھاڑ کرتا ہے۔ کبھی تکلیفوں کی آنچ دے کر اپنی یاد دلاتا ہے وہ چاہتا ہے کہ مرد اس کی اور صرف اس کی طرف متوجہ ہو..... لیکن مرد شاذ و نادر ہی اپنے خالق کی آواز سنتا ہے۔

(ہلکا سا وقفہ)

شمس: بدنصیب بچہ ہے کہ ماں کی گود سے بندھی ہوئی عافیت کو نہیں سمجھتا..... بد قسمت عورت ہے کہ مرد کے مضبوط کندھوں کا سہارا لے کر آندھی طوفان سے مقابلہ نہیں کرتی..... لیکن ڈاکٹر صاحب سب سے زیادہ سب سے بڑھ کر ------ بد قسمت مرد ہے کہ وہ خدا کی ذات سے وابستہ ہونے کے بجائے' ہر قسم کے خوف اور حزن سے آزاد ہونے کے بجائے ہمیشہ عورت کی طرف رجوع کرتا ہے..... اپنے خالق کی بجائے اپنی تخلیق کی طرف لپکتا ہے ------ لیکن یقین کیجئے ڈاکٹر صاحب ہر تخلیق بے رحم ہوتی ہے..... کسی

تصویر کو مصور کی پروا نہیں ہوتی...... کوئی غزل اپنے شاعر سے محبت نہیں کرتی ...... کوئی حسن اپنے کری ایٹر کا شکر گزار نہیں ہوتا۔

(اس وقت باہر سپاہی لمبی سی سیٹی بجاتا ہے۔ دونوں خاموشی سے اسے سنتے ہیں۔)

شمس: جس طرح یہ سیٹی بج رہی ہے سر...... جس طرح یہ سگنل ہے.... جاگتے رہنے کا.... جگائے رکھنے کا...... ایسے ہی مرد کی زندگی میں پینتالیس برس یا حد پچاس برس کی عمر میں ایک سیٹی ضرور بجتی ہے...... ایک گھنٹی کی آواز آتی ہے۔ سنائی دے نہ دے لیکن ایک الارم ضرور بجتا ہے...... اندر باجے روپ میں...... یہ ایک سگنل ہوتا ہے ڈاکٹر صاحب کہ اب مرد تمام کاج چھوڑ کر ...... تمام مصروفیات سے رخصت لے کر...... ہر وارفتگی اور شیفتگی سے منہ موڑ کر اپنے خالق کی طرف توجہ کرے۔ اسے پہچانے اور اس کی محبت میں ڈوب کر ایک ہو جائے لیکن آپ کو معلوم ہے کیا ہوتا ہے ڈاکٹر صاحب...... جب یہ گھنٹی بجتی ہے اور خدائی محبت کی بارش اوپر سے ہوتی ہے تو مرد اس بارش میں شرابور ہو کر...... پھر اپنی تخلیق کی طرف بھاگتا ہے...... وہ اللہ کی طرف لوٹنے کے بجائے پھر عورت کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ دوسری شادی کا سامان پیدا کرنے لگتا ہے۔ نیا گھر بسانے کی فکر میں لگ جاتا ہے...... یہ پچاس سے پچپن ساٹھ برس کی عمر بڑی خطرناک ہے ڈاکٹر صاحب...... بہت خطرناک ......

کٹ ———

سین 28 ان ڈور رات

(ڈاکٹر صاحب کی بیوی ڈاکٹر صاحب کا سامان پیک کر رہی ہے۔ ٹیپ ریکارڈر بج رہا ہے۔)

It'sgoingtotakesometime,thistime....

——— کٹ

سین 29 ان ڈور رات

(ڈاکٹر اور شمس کے پاس واپس:)

ڈاکٹر: آپ کون ہیں شمس صاحب...... اور آپ کہاں کے رہنے والے ہیں اور آپ...... کس طرح...... میرا مطلب ہے......

شمس: مرد کی ادھیڑ عمر...... اپنے خالق سے وابستگی کی عمر ہے ڈاکٹر صاحب ---تیاری کی عمر ہے--- اگلے سفر کے لئے بورڈنگ کارڈ لینے کی عمر ہے۔ ...... بڑا فضل ہوتا ہے اس عمر میں...... بڑا خصوصی کرم ہوتا ہے اس عمر میں خالق کا...... اور کسی عمر میں ڈائریکٹ سگنل نہیں بھیجتا اس کا خالق لیکن اس عمر میں ضرور بلاتا ہے اپنی طرف...... اس عمر میں بلاوے کی گھنٹی ضرور بجتی ہے

...... لیکن بدقسمتی یہ ہے ڈاکٹر صاحب کہ مرد اس گھنٹی کی آواز نہ سمجھ کر...... اور اس سگنل کا مطلب نہ جان کر...... روح کی آواز کو جسم کی پکار سمجھ لیتا ہے اور عموماً دوسری شادی کر لیتا ہے اور جوان لوگ یہ پوچھتے ہیں کہ بابا نے اس عمر میں یہ کیا کیا۔ جگ ہنسائی ہوتی ہے نقصان ہوتا ہے۔ منزل کھوٹی ہو جاتی ہے ...... مرد کی زندگی کی یہ کٹھن ترین منزل ہے...... خوش قسمت مرد اس سگنل کا مفہوم سمجھ کر اڑنے والے قالین پر بیٹھ کر بلند ہو جاتا ہے اور حقیقت ناآشنا آدمی اسے دھرتی کی آواز سمجھ کر اپنی لٹ نیچے لے جاتا ہے...... عورت کو اسی لئے تو دھرتی کہتے ہیں سر...... کہ اس کی جڑیں پاتال میں ہوتی ہیں۔

(ڈاکٹر حیران کھلے منہ سے شمس کو دیکھ رہا ہے۔)

شمس: مرد سنگل بینڈ کا ریڈیو ہے سر۔ اس پر صرف ایک سٹیشن ہی بج سکتا ہے۔ وہ دوسری فریکوئنسی کو کیچ ہی نہیں کرتا۔ اسے جب بھی محبت کا سگنل ملتا ہے وہ اسے عورت کی محبت کا سگنل ہی سمجھتا ہے...... عورت دھرتی ہے ڈاکٹر صاحب۔ اس کا سب کچھ یہاں ہے...... سب کچھ ادھر اُدھر بکھرا ہوا ہے۔ کیونکہ اس کا بچہ یہاں ہے———

(ڈاکٹر صوفے سے اٹھ کر شمس کے پاس بیٹھتا ہے اور اس کے کندھے پر دونوں ہاتھ رکھ کر کہتا ہے:)

ڈاکٹر: تم یہ سب کچھ کیوں کہہ رہے ہو شمس؟ کس سے کہہ رہے ہو؟

شمس: پچاس پچپن کی عمر کے بعد عورت دھرتی زمین اور عورت کی اولاد، خدا اور مرد کے درمیانی فاصلے کا نام ہے...... اس ایک فاصلے سے اور کئی فاصلے جنم لیتے ہیں۔ ری ایمپلانٹنٹ کا فاصلہ، مربعے آباد کرنے کا فاصلہ، دھرتی سے چمٹنے کا فاصلہ۔ خالق بلاتا رہتا ہے اور فاصلے بڑھتے رہتے ہیں۔ اس عمر میں عورت آسمان پر چڑھنے والے غبارے کو زمین پر اتار کر اسے اپنی دھوپ چھتری بنا کر لان میں نصب کر لیتی ہے...... پھر اس کے سائے تلے بیٹھ کر وہ اپنے بچوں کے لئے سویٹر بنتی ہے اور اس کے بچے اس دھوپ چھتری کے ڈنڈے میں ہاتھ ڈال کر چکر پھیریاں لیتے ہیں...... اور مرد آفاقی سگنل کا پیغام نہیں سمجھتا...... بچوں کی پرورش کا فاصلہ۔ اور یہ فاصلہ مرد کے لئے عارف مولا کے لئے موت سے بھی بدتر ثابت ہوتا ہے پھر وہ ایک کاغذی وجود بن جاتا ہے جس میں حرکت ضرور ہوتی ہے لیکن روح نہیں رہتی----- مور کافی سر؟

ڈاکٹر: (چونک کر) ہوں----- نو تھینک یو----

(شمس اٹھ کر اسی آہستگی اور گریس سے چلا جاتا ہے' جس طرح وہ چلا کرتا ہے ڈاکٹر صاحب پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ حیران و پریشان بیٹھے ہیں اور ان کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل سکا۔) ------ڈزالو

سین 30ان ڈور علی الصبح

(صبح کے وقت مرغ کی اذان۔ ڈاکٹر صاحب اسی طرح صوفے پر بیٹھے ہیں اور ان کی کافی کی پیالی اسی طرح رکھی ہے اور ساری رات گزر چکی ہے۔ رضیہ بیگم بچے کو گود میں اٹھائے اور فیڈر ہاتھ میں لئے داخل ہوتی ہیں۔)

رضیہ: ہائے میرے اللہ ڈاکٹر صاحب آپ سوئے نہیں۔

ڈاکٹر: نہیں۔

رضیہ: کیوں کیا بات ہے۔

ڈاکٹر: کچھ نہیں۔

رضیہ: سات بج رہے ہیں اور آپ کو جانا بھی ہے۔ اور ناشتہ بھی ابھی تک نہیں لگا۔ رحمان۔ رحمان گل ...... رحمان ---- کدھر دفع ہو گئے آج سب۔

رحمان: جی بیگم صاحب

رضیہ: بھئی ابھی تک ناشتہ نہیں لگا۔ دیکھو وہ کیا کر رہا ہے شمس باورچی خانے میں۔

رحمان: جی بہت اچھا۔

رضیہ: آپ نے حد کر دی ڈاکٹر صاحب۔ ساری رات یہیں گزار دی۔

ڈاکٹر: میں کچھ کاغذات وغیرہ دیکھتا رہا' اپنے پیپر چھانٹتا رہا' جو کسی زمانے میں لکھے تھے۔

رضیہ: لیکن اتنا لمبا سفر اور آپ جاگتے رہے ساری رات----

ڈاکٹر: میں جہاز میں نیند پوری کر لوں گا۔ وہاں اور کوئی کام تو ہوتا نہیں۔ پھر مجھے جہاز میں نیند بھی بہت اچھی آتی ہے۔

رحمان: وہاں تو نہیں ہے جی شمس۔

رضیہ: تو اسے اس کے کوارٹر میں دیکھو۔

رحمان: کوارٹر میں بھی نہیں ہے بیگم صاحب۔ میں دیکھ آیا ہوں۔

رضیہ: تو اس کو ادھر دیکھو...... وہ کیا نام......

رحمان: کوارٹر میں نہ اس کا بستر ہے نہ ٹرنک۔ بس خالی چارپائی پڑی ہے۔

رضیہ: ہائے میرے اللہ...... بھاگ گیا۔ دیکھا ڈاکٹر صاحب میں نہ کہتی تھی کہ مجھے مشکوک آدمی دکھائی دیتا ہے...... اطہر------ اطہر------ ادھر آؤ تم میرے ساتھ...... لبنیٰ' اشہر جلدی باہر آؤ...... شمس بھاگ گیا...... دیکھو اپنی چیزیں ساری۔

(رحمان گل کو ساتھ لے کر اس کا کوارٹر دیکھنے چلی جاتی ہے ڈاکٹر صاحب بڑے سبھاؤ کے ساتھ خاموش ایک ہی ٹکٹکی باندھے بیٹھے ہیں۔ اتنے میں اطہر ایک طرف سے اور لبنیٰ اور اشہر دوسری طرف سے بڑبڑائے ہوئے داخل ہوتے ہیں۔)

لبنیٰ: کیا ہوا ابو۔ کیا ہوا

ڈاکٹر: کچھ نہیں۔ شمس چلا گیا۔

اطہر: بھاگ گیا؟

اشہر: کسی کو بتائے بغیر؟

اطہر: ایسے گیا ہے تو بتائے بغیر ہی گیا ہو گا۔

اشہر: تم اپنا جیولری بکس تو دیکھو جا کر جلدی سے۔ (لبنیٰ بھاگ کر اندر جاتی ہے)

ابو آپ نے اپنا کیش دیکھ لیا ہے۔ ڈالرز اور زیور پیکس وغیرہ۔

ڈاکٹر: میرا سب کچھ تو اس بریف کیس میں موجود ہے۔

اشہر: میرے پاس کلب کا کچھ کیش تھا۔

(بھاگ کر اپنے کمرے میں جاتا ہے۔ دوسری طرف سے رضیہ بیگم داخل ہوتی ہیں۔)

رضیہ: بالکل صفا چٹ۔ سب خالی۔ کوارٹر میں صرف ایک چارپائی۔ بھاگ گیا ہے کمبخت۔

لبنیٰ: (داخل ہو کر) تھینک گاڈ۔ میر جیولری تو صحیح سلامت ہے...... آپ نے اپنی الماری دیکھ لی امی۔

رضیہ: میری الماری پر تو خدا کا فضل ہے۔ کل ہی رکھوایا تھا میں نے اپنا سب کچھ لاکر میں کہ ڈاکٹر صاحب جا رہے ہیں مجھے ان چیزوں کی کیا ضرورت۔

اطہر: کیوں بھئی اشہر؟

اشہر: (جو فیلڈ میں داخل ہو رہا ہے) مجھے تو ٹھیک ہی لگتے ہیں۔ دو سو اکسٹھ روپے۔ شاید اتنے ہی تھے۔

رضیہ: میں آپ سے کہتی نہیں تھی ڈاکٹر صاحب کہ یہ منحوس گھنّا مجھے زہر لگتا ہے۔ کافی سر----- تھینک یو سر----- نو سر----- یس سر ----- کیا مجال جو اس کے سوا ایک لفظ بھی نکلا ہو اس نے اپنی زبان سے۔

اطہر: کچھ مکار سا لگتا تھا شکل سے۔ اسی لئے خاموش رہتا تاکہ......

اشہر: کہیں میری حماقت کا بھید نہ کھل جائے۔

لبنیٰ: لیکن یہ اس نے کیا کیا ابو۔

اشفاق صاحب کے بنائے ہوئے سیخ کبابوں کا پورے لاہور میں کوئی ثانی نہیں.....

رضیہ: جو اس نے کیا ہے اس کا پتہ ہم کو آہستہ آہستہ چلے گا۔ بعد میں ---- اب تو سب نے اپنی موٹی موٹی چیزیں دیکھ لی ہیں ناں اور خوش ہو گئے ہیں۔ لیکن جب ذرا وقت گزرا تب احساس ہو گا کہ ہمارا کس قدر نقصان کر گیا ہے ایک ایک کا...... ڈاکٹر صاحب یہ آپ کو مل کہاں گیا تھا۔

ڈاکٹر: ایسے ہی ایک دن کلینک پر آ گیا تھا بغیر کسی تعارف سفارش کے۔ کہنے لگا مجھے نوکر رکھ لیجئے۔ میں بہت اچھا خانساماں ہوں ---- میں نے رکھ لیا۔

رضیہ: تم ایک مرتبہ جا کر پھر اپنی اپنی چیزیں دیکھو ---- ایسی مسکین شکل والے بڑے طریقے سے واردات کیا کرتے ہیں۔ اور لبنی تم ابو کے لئے ناشتے کا بندوبست کرو ---- ان کی فلائیٹ میں صرف ایک گھنٹہ رہ گیا ہے۔

ڈاکٹر: میں نے جانے کا ارادہ ترک کر دیا ہے رضیہ بیگم۔

رضیہ: کیا!

لبنی: کیوں ابو!

اشعر: کیا ابو!

ڈاکٹر: بس ایسے ہی...... کوئی خاص بات نہیں۔ اب اس عمر میں میں ایک اور ڈپلومہ لے کر کیا کروں گا۔

رضیہ: (خوش ہو کر) اچھا ڈاکٹر صاحب چلئے وہ تو ٹھیک ہے ---- لیکن آپ اس کمبخت کا بھی کچھ پتہ کرائیں شمو کا ---- مجھے تو سو فیصد یقین ہے کہ اور کسی کا ہو نہ ہو میرا ضرور نقصان کر گیا ہے کمبخت۔ دیکھو بھاگا کیسے آدھی رات کو...... ڈاکٹر صاحب آپ تو جاگ رہے تھے

(فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب جلدی سے اٹھتے ہیں اور فون کے پاس جا کر چونگا اٹھا کر: سکنک کرتے ہیں اور پھر چونگا میز پر رکھ دیتے ہیں۔ گھر کے سب لوگ حیران پریشان خاموش کھڑے ہیں۔ فضا میں بڑی حیرت کشیدگی اور خاموشی ہے۔)

سوالاکھ کا ہاتھی

اشفاق احمد

مفتی پر کچھ لکھتے وقت دراصل مجھے دو مشکلوں کا سامنا ہے۔ ایک تو یہ کہ میں نے کبھی کسی کا خاکہ نہیں لکھا۔ خاکہ اڑایا ضرور ہے مگر لکھنے کے معاملے میں نا آشنائے محض ہوں۔ دوسری مشکل یہ ہے کہ ادب کے ناقدوں نے ہر صنف ادب کے بارے میں کچھ پابندیاں عائد کر رکھی ہیں اور آپ اس بیکل فریم ورک سے باہر نہیں نکل سکتے۔ خاکہ نگار کے لئے یہ پابندی عائد ہے کہ خاکہ لکھتے وقت خاکہ نگار اپنے خاکوانی کی مکمل مدح سرائی نہیں کر سکتا اور اس کو ایک اچھے اعلیٰ اور معیاری شخص کے طور پر پیش نہیں کر سکتا۔ اس کی شخصیت میں تھوڑی بہت برائی ضرور شامل کرنی پڑے گی خواہ وہ مانگے کی برائی ہی کیوں نہ ہو۔ کسی شخص کو پورے کا پورا بدمعاش عیار بے ایمان اور ظالم پیش کرنے کی البتہ پوری آزادی ہے --- ابتدائے ایام میں میں نے اپنے دو دوستوں کے تین خاکے لکھے تھے لیکن ایڈیٹر نے انہیں اس وجہ سے ناقابل اشاعت قرار دے کر واپس بھیج دیا کہ ان میں ساری اچھی اچھی باتیں ہی تھیں اور اچھی اچھی باتیں پڑھ کر قارئین کے بے مزا ہونے کا اندیشہ تھا ساتھ ہی اس سے میری شہرت کو گزند پہنچنے کا احتمال بھی تھا اس لئے ان کی اشاعت روک دی گئی۔ دوسری پابندی خاکہ نویس پر یہ لگائی گئی ہے کہ وہ خاکوانی کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنا ذکر بالکل نہ کرے اور یہ ہرگز ظاہر نہ ہونے دے کہ وہ خاکوانی کو جانتا ہے۔ کیونکہ اگر ایسا ہوا تو اس پر یہ حد قائم ہو جائے گی کہ اس نے اپنے ممدوح کی شہرت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر خود کو بلند کرنے کی کوشش کی ہے اور ممدوح کو بطور ایک لیور کے استعمال کیا ہے۔ یہ دوسری پابندی جو سراسر گھاٹے کا سودہ ہے'

میں پھر بھی برداشت کرنے کو تیار ہوں لیکن پہلی پابندی کے ساتھ میری مصالحت ذرا مشکل ہے۔ میں پیر پرست اور لیڈر پرست قسم کا انسان ہوں۔ جس کی محبت میں ڈوبا پورے کا پورا ڈوبا۔ جب بیزاری پیدا ہوئی تو ٹوپی سوٹی لے کر باہر نکل گیا۔ یہ مجھ سے نہیں ہوتا کہ ہاں اچھے بھی ہیں اور انسانی کمزوریوں سے بھی مملو ہیں۔ لمبے بھی ہیں اور گنجے بھی۔ راست گو بھی پر دروغ گوئی سے کام لیتے ہیں۔ رنگت گوری ہے لیکن جلد کالی ہے۔ موذیل ہیں یا ہو گوپی ناتھ میں کالو بھنگی ہیں ------ معافی چاہتا ہوں مجھ سے گرے پینٹ نہیں ہوتا۔

ممتاز مفتی ایک ایسا ہمدرد مجسی' انسان دوست اور خدائی خدمتگار قسم کا انسان ہے کہ بالآخر آدمی اس کی محبت سے تنگ آکر بھاگ جاتا ہے اور ظالم زمانے کی آغوش میں پناہ ڈھونڈتا ہے اور وہاں بیٹھ کر مفتی پر روڑے پھینکتا ہے جن میں سے کوئی بھی اسکو نہیں لگتا وہ ان روڑوں کو جمع کر کے اپنے روپے کی کرم پک سے ایسا عرق پتال جنتر کرتا ہے جو اس روڑا پھینکنے والے کو دن میں تین مرتبہ چنا پڑتا ہے اور عمر کے آخری حصے تک اس عرق کے سہارے جینا پڑتا ہے۔ آپ اس کے دوست ہیں دشمن بن جائیں' تعلق رکھیں' تعلق توڑ لیں' زندہ رہیں' فوت ہو جائیں ممتاز مفتی آپ کے آس پاس ہی رہتا ہے۔ اصل میں مفتی کے لئے ہر موجود اور ناموجود ایک معجزہ ہے اور اس کے نزدیک ناموجود' موجود سے قوی تر ہے اور معجزہ حقیقت سے زیادہ پائیدار اور قابل اعتماد ہے اور نامعلوم اور ناشناخت کا علم معلوم کے علم سے وسیع تر اور درخشندہ تر ہے۔ اب آپ خود ہی بتائیے کہ ایسی سوچ والے انسان کے ساتھ آپ کہاں تک چل سکتے ہیں۔ اور ایسی سوچ کا انسان آپ کو کچ سمجھدار کے چھوڑ بھی کیسے سکتا ہے۔ ممتاز مفتی سے دوستی گو آسانی کے ساتھ لگائی جا سکتی ہے لیکن اس کو نبھانا بہت مشکل ہے کہ یہ روایت کا بندہ نہیں' بندھی گی رہتوں کو نہیں مانتا پر لوک ریت کے گھروندے میں رہتا ہے اور عملات کے آگے دست بستہ کھڑا ہے مجھ پر اور میرے بال بچوں پر اور میرے گھرانے پر ممتاز مفتی کے بڑے احسان ہیں۔ ہم زندگی کے کسی بھی چلن میں بے راہ رو ہوئے یہ بھاگ کر ہمارے لئے ٹیکسی لے آیا۔ ہم نے بھولے سے بھی کوئی بھلائی کا راستہ اختیار کیا مفتی کھڑاویں پہن' کر منڈل ہاتھ میں لے ہمارے ساتھ چل پڑا کہ راستے میں بچوں کو کسی چیز کی ضرورت ہوگی اور بچوں کے باپ کو چلنے میں دقت ہوگی تو باپ کے لئے تو دری بچھا دوں گا اور بچوں کو قریب سے ناشتہ کرا کے لے آؤں گا۔ رہی بانو قدسیہ تو اس کو اڑتی چڑیا کے پر گن کر بتلا دوں گا کہ ایک طرف تیرہ ہیں اور دوسری طرف اکیس اور یہی وجہ ہے کہ ہر اڑتی ہوئی چڑیا جھپ کھاتی ہے اور جب جھپ کھاتی ہے تو شکرے کی پکڑ میں آجاتی ہے اور جب شکرے کی گرفت میں آجاتی ہے تو بانو قدسیہ اس پر ڈرامہ لکھتی ہے اور جب اخبار چھپتا ہے تو اس میں آدھے صفحے کا مضمون ہوتا ہے Morbid world of Bano Qudcia۔

اس مضمون کو پڑھ کر مفتی پہلے ہنستا ہے اور پھر روتا ہے۔ ہنستا اس لئے ہے کہ جاہل تمثیل نگاروں کے ساتھ یہی ہونا چاہیے اور روتا اس لئے ہے کہ جاہل نقاد کو اصل بات سمجھ میں نہیں آئی اور وہ کواب کے اس ٹکڑے کو لاٹھی کے گز سے ناپ گیا۔

مفتی کو اپنے ملک کی ہر حکومت سے بے پناہ محبت ہے اور وہ اس کی

صحت اور سلامتی کی طویل دعائیں مانگا کرتا ہے اس کے نزدیک اپنی حکومت کو پسند کرنے کی وجہ صرف ایک ہے کہ ہر پاکستانی حکومت ہر ملک اور ہر مقام اور ہر ادارے سے بلا اشتنئے قرض لیتی ہے اور دبا کے لیتی ہے' اور بڑی شریفانہ زندگی بسر کرتی ہے۔ اپنی قرضہ لینی حکومتوں سے متاثر ہو کر اس نے ایک انوکھا فارمولا وضع کر رکھا ہے جس پر وہ شاید خود تو گامزن نہیں لیکن دوسروں کو اس پر عمل کرتے دیکھنے کا دل سے متمنی ہے۔ مفتی کی ہم سب کو ایک ہی نصیحت ہے کہ ہمیشہ اپنی آمدنی کے اندر رہ کر زندگی بسر کرو خواہ اس کے لئے تم کو قرض لے کر ہی ایسا کیوں نہ کرنا پڑے۔

اگر آپ کو کبھی اس کی خوابگاہ میں جانے کا اتفاق ہو تو آپ دیکھیں گے کہ مفتی کے پلنگ کے نیچے طرح طرح کے ڈبے۔ صندوقچیاں۔ سوٹ کیس۔ اٹاچی اور ڈھکنے والی ٹوکریاں انتہائی بدنظمی کی حالت میں بڑے سلیقے کے ساتھ رکھی ہوئی ہیں۔ آپ سے باتیں کرتے کرتے وہ اپنے پلنگ پر لیٹا لیٹا' ادھ کھلے چاقو کی طرح پلنگ کے نیچے اس طرح چلا جائے گا کہ چاقو کا دستہ بستر پر رہے گا اور پھل نیچے اتر کر پھرولا پھرلی شروع کر دے گا۔ آپ دستے سے باتیں کر رہے ہیں اور دستہ باقاعدگی سے جواب بھی دے رہا ہے لیکن نیچے کی تحقیق و تفتیش گہرے انہماک کے ساتھ ساتھ جاری ہے۔ دس پندرہ منٹ کی کدوکاوش کے بعد وہ مطلوبہ چیز نکال کر آپ کے سامنے پیش کر دے گا اور چاقو بستر پر بند ہو کے اوپر کمبل کھینچ لے گا۔ مطلوبہ چیزوں میں عام طور پر آپ کے بچوں کے لئے میٹھی گولیاں۔ آپ کی بیوی کے ٹوٹے ہوئے ناخن کے لئے نیل کٹر۔ آپ کے ملازم کے لئے عطر حنا کی پرانی شیشی کا کارک اور خود آپ کے لئے وہ چٹھی ہوتی ہے جو آپ نے قیام پاکستان سے تین سال قبل بھٹنڈے کے ریلوے سٹیشن سے لاہور قصور کے پتہ پر لکھی تھی اور جس پر جارج ششم کی ایک پیسہ کم وہ ٹکٹ لگی تھی جس نے اس چٹھی کو دو پیسے کا بیرنگ کر دیا تھا۔ اس خط میں آپ نے وہ جھک ماری تھی کہ اگر آپ کے بیٹوں پوتوں کو اب پتہ چل جائے تو وہ آپ کو سفید بالوں سمیت گھر سے نکال دیں اور اپنے نان نفقے سے عاق کر دیں۔ اب چٹھی آپ کے ہاتھ میں ہے اور چاقو دوسری طرف منہ کر کے لیٹا ہوا ہے۔ کاغذ پر آپ کی تحریر موجود ہے اور چٹھی کی یہ ہیئت ہے کہ نہ توڑنی نہ مروڑنی نہ پھینکنی نہ چھپانی نہ سوختنی نہ فروختنی۔

مفتی کے مرد دوستوں اور خواتین دوستوں کے اپنے اپنے الگ تجربات ہیں اور دونوں نے ایک دوسرے سے الگ اور مختلف النوع نتائج اخذ کر رکھے ہیں۔ عورتیں مفتی جی کو ایک مجبوب صفت "اکھڑ' منہ پھٹ' لپلپا اور جھنجھوڑ ور گر سمجھتی ہیں۔ مرد انہیں بانکا۔ بچھیلا۔ دل باز' پرگو۔ غم ساز' دردمند' شفیق اور مجبتی اماں وڈھی سمجھتے ہیں۔ لیکن بہت کم لوگ اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ اس بڑے قالب میں تاروں کی چھاؤں تلے آسمانوں کے فرشتے اماں وڈھی اور قادر گر کا نکاح پڑھا چکے ہیں۔ اور دونوں بابا بابی ممتاز مفتی کے وجود کی سوئس کاٹیج میں بڑی پرامن زندگی گزار رہے ہیں۔

محبت کرنے والے لوگوں کی زندگی کے کئی پہلو بڑے خطرناک ہوتے ہیں اور ان کی megnatic field میں آجانے سے بڑے زور کا دھماکا ہوتا ہے لیکن ہماری اماں وڈھی کی مجبتی زندگی کا ایک پہلو ہی خطرناک ہے۔ اگر اس میں سے آپ سبھاؤ کے ساتھ گزر گئے تو پھر ساتوں خیریں ہیں اور اگر یہاں رک گئے تو پھر اتنے زور کا دھماکا ہو گا کہ آپ کی نظروں کے سامنے آپ کے چیتھڑے اڑ جائیں گے اور کمیٹی کے پرانے کاغذوں میں صرف آپ کا نام ہی رہ جائے گا۔ اگر آپ پہلی مرتبہ مفتی جی سے ملنے جا رہے ہیں تو آپ کو اپنے ساتھ کوئی جسمانی عارضہ لے کر جانا ہو گا اور اگر آپ آخری مرتبہ ان سے سرودھنواں پیر لے کر لوٹ رہے ہیں تو بھی آپ کو اپنی بیماری کے لئے ان سے ہومیو پیتھک کی پڑیا لے کر لوٹنا ہو گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ مفتی جی سے مل کر آ رہے ہیں اور آپ کی جیب میں ہومیو پیتھک گولیوں کی شیشی نہیں ہے۔ مسعود۔ عمر۔ عماد اور اعظمی کی مفتی سے چالیس سال پرانی دوستی ہے اور سب نے مفتی کی خوشنودی کے لئے کوئی نہ کوئی بیماری پال رکھی ہے۔ جس کی تفصیل جاتے ہی بیان کرنا مفتی سے محبت کے قرینوں کا پہلا قرینہ ہے۔ مسعود چونکہ ہم سب میں زیادہ ذہین' تیز فہم اور سبک رو ہے اس لئے وہ گھر سے ہی کوئی بیماری سوچ کر چلتا ہے۔ عمر بے حد سادہ لوح۔ معصوم اور گھامڑ ہے اس لئے اس کو مفتی کے دروازے پر پہنچ کر یاد آتا ہے کہ اس کے پاس تو پیشکش کے قابل کوئی بیماری ہی نہیں اس لئے گھنٹی بجانے سے پہلے اس کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔ پھر وہ ہم سب کی منتیں کرتا ہے۔ واسطے ڈالتا ہے اور دروازے کے سامنے بازو تان کر کھڑا ہو جاتا ہے کہ جب تک مجھے کوئی بیماری نہیں کرو گے اور اسے اچھی طرح نہیں سمجھاؤ گے میں تم کو اندر جانے نہیں دوں گا۔ مسعود کہتا ہے "یار تم اس سے کہہ دینا کہ پیشاب رک رک کر آتا ہے۔ جلن بھی ہوتی ہے اور کبھی کبھی ٹیس بھی اٹھتی ہے۔ عمر پریشان ہوتا ہے کہ اگر اس نے پوچھ لیا ٹیس کس قسم کی ہوتی ہے تو میں کیا جواب دوں گا۔ مجھے تو کبھی ٹیس اٹھی ہی نہیں۔ اعظمی کہتا ہے شرم کرو یار کیا جاتے ہی بول و براز کی باتیں شروع کر دو گے اچھا لگے گا بھلا دیکھو عمر اس سے کوئی سادہ سی بات کر دینا کوئی سیدھی سی بیماری عماد کہتا ہے سیدھی سی بیماری سے وہ ناراض ہو جائے گا اور اس کو جوتے مار کر نکال دے گا۔ تم یہ رک رک کر آنے والے پیشاب کا ہی ذکر کرنا عمر۔ اعظمی کہتا ہے کان

کی تکلیف بھائی کان کی۔ اور مسعود آگے بڑھ کر گھنٹی بجا دیتا ہے۔ سب دوستوں کو اس طرح ایک ساتھ باجماعت آتے دیکھ کر مفتی کی باچھیں کھل جاتی ہیں اور وہ سب کے لئے پان لگانے بیٹھ جاتا ہے۔ مسعود اپنی بیماری کی تفصیلات پیش کرتا ہے اور اس کو دوائی دینے کا وعدہ ہو جاتا ہے۔ عماد اپنے عارضے میں بڑھوتری کا ذکر کرتا ہے اس کو بتایا جاتا ہے کہ ابھی تین دن تک رہی دوائی کھاؤ۔ اعظمی عینک اتار کر اپنی آنکھیں دکھاتا ہے۔ مفتی کہتا ہے پان لگا کر روشنی میں دیکھوں گا۔ اب عمر کے ہاتھ پاؤں پھول رہے ہیں اور خوف سے رعشہ طاری ہے۔ ہکلا کر کہتا ہے مفتی میرے کان میں بڑی تکلیف ہے "مفتی غصے سے اس کی طرف دیکھ کر کہتا ہے "گدھے آدمی تکلیف ہونا کے کیا معنی پورے سمپٹمز بیان کرو ایک ایک کر کے عمر کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں اور وہ کپکپاتی آواز میں کہتا ہے اس میں سے پیشاب رک رک کر آتا ہے۔ سب پر ہنسی کا دورہ پڑتا ہے تو مفتی کھچے کا ہاتھ روک کر سنجیدگی سے کہتا ہے اس کے لئے تو کتاب دیکھنی پڑے گی چمن جی۔ تم مجھے سارے سمپٹمز لکھ کر دے جاؤ ایک ایک کر کے پھر میں غور کروں گا۔ اس کی ہے ایک دوا۔ کنول کے ڈوڈے سے نکلتی ہے شاید یا کپاس کے کوکلے سے۔ اس وقت مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کل کتاب دیکھ کر بتاؤں گا۔ اور کل عمر ٹیلیفون ہاتھ میں پکڑے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھے خوفزدگی کے عالم میں روہانسا ہو کر چیخ رہا ہوتا ہے "حرام زادو اب سمپٹمز بتاؤ تمہارا باپ پوچھ رہا ہے ادھر سے"

مفتی کے پاس روحانیت کا بڑا گہرا علم ہے۔ ہمارے جیسا کتابی اور غیر نافع علم نہیں بلکہ کیفیات میں سے گزر کر حاصل کیا ہوا علم۔ اس کے کچھ حصے جن کا تجربے سے گہرا تعلق ہے وہ تو سمجھ کے قریب آتے ہیں لیکن ایسی باتیں جن کو وہ کبھی کبھی بہت اونچی آواز میں کہتا ہے ان کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ میں اندر ہی اندر چونکہ اس سے بہت مرعوب ہوں اور باہر اپنے اور اس کی باتوں کے درمیان تلوار رکھ کو سوتا ہوں اس لئے اس کی اونچی آواز کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ وہ جو ایک عرصہ سے امام کے انتظار میں اور غلبہ اسلام کی امید میں بیٹھا دھوپ سینکا کرتا ہے اس کے جھوٹے جھوٹے آثار تو میرے جیسے تشکیک زدہ کو بھی نظر آتے ہیں یا اب آنے لگے ہیں۔ لیکن ایسی باتیں کبھی میرے پلے نہیں پڑتیں جب عکسی اپنی کار گھما کر پارکنگ لاٹ تلاش کیا کرتا ہے اور ایک مری جیسی جگہ میں کار پھنسا کر کہتا ہے اب آپ لوگ پیچھے چھلانگ کر پچھلے دروازوں سے نکلیں کیونکہ آگے کے تو کھل نہیں سکتے۔ اس وقت مفتی پر اس کا man made کشف وارد ہوتا ہے اور وہ آنکھیں گھما کر کہتا ہے "او جی عکسی جی جس طرح پارکنگ کی بہترین جگہ ہمیشہ سڑک کی دوسری جانب ہوتی ہے اسی طرح بہترین بیوی، بہترین نوکری، بہترین گھر" بہترین اپرچونٹی ہمیشہ اپنے سے مخالف سمت میں ہوتی ہے۔ واہ جی واہ عکسی اس کی ایسی باتوں سے بہت چڑتا ہے اور گھبرا کر کہتا ہے "بس کر ابو۔ بولے نہ جا"۔ میں بھی اس کی ایسی باتوں سے بہت چڑتا ہوں۔ لیکن صرف اندر سے اور چونکہ میں اسی کو "بس کر مفتی بولے نہ جا" نہیں کہتا اس لئے یہ مجھ سے ناراض ناراض سا رہتا ہے۔

مفتی دراصل حزب اقتدار کا آدمی ہے۔ ٹانگ چھانک بے سروسامانی۔ بے ملک و بے ثروت ہونے کے باوجود ہر قسم کی حزب مخالف کو دعوت کلوخ زنی دیتا رہتا ہے۔ جب تک کوئی مفتی کو طعنہ نہ دے چونڈی نہ کاٹے۔ شارٹ نہ مارے دھکا نہ دے۔ یہ مضمحل اور بیمار بیمار سا رہتا ہے اس لئے اس کے سارے دوست اور جگری یار نہ ماننے والے لوگ ہیں۔ جس دن آپ بدقسمتی سے اس کے ہم خیال اور ہم فکر ہو گئے۔ یہ سالم ٹیکسی لے کر خود آپ کو آپ کے گھر چھوڑ کر آئیگا اور تیسرے دن سارے دوستوں کو اپنے گھر سوئم پر جمع کر کے آپکی آخری فاتحہ کر دے گا۔ مجھ پر اس نے نو مرتبہ فاتحہ کہا اور ایک مرتبہ میرے چہلم کا اہتمام بھی کیا لیکن میں اس کے حزب مخالف میں شامل ہو کر پھر اس کا گہرا دوست بن گیا۔ اکثر کہا کرتا ہے کہ میری زندگی کے پہلے پینتالیس سال بڑی بے کیفی اور بے لذتی میں گزرے اور میں نے یہ سارا عرصہ مایوسی خواری پریشانی اور دردمندی میں گزارا۔ پھر خدا کے فضل سے پاکستان بننے کے چند سال پہلے "رجعت پسند" کی ترکیب وضع ہوئی اور میرے سوکھے دھانوں پانی پھرا۔ مجھے زندہ رہنے اور زندگی کرنے کا ایک سہارا ملا اور میری صحت اچھی ہونے لگی۔ اب جب سے فنڈا منٹلسٹ کا لفظ ایجاد ہو کر آیا ہے مفتی پہلے سے زیادہ صحتمند اور چاق و چوبند ہو گیا ہے۔ ملا لوگوں کی اس طعن و تشنیع اور چونڈی ونڈی نے ممتاز مفتی کو ایک عامل کامل صوفی بنا دیا ہے۔ وہ کسی ورد وظیفے' نماز روزہ سے یا ذکر اذکار سے اس مقام پر نہیں پہنچا ملامتوں کا ٹکٹ سجا کر اہل صفا میں جا بیٹھا ہے کوئٹہ کے ایک باریش اور باشرع صوفی جب پنڈی اسلام آباد آئے تو انہوں نے مہینہ ڈیڑھ مہینہ مختلف حلقہ ہائے صوفیاں کا جائزہ لینے کے بعد ممتاز مفتی کو پنڈی اسلام آباد کا پیر طریقت مقرر کر دیا اور ہم سب پر اس کی اطاعت لازم کر دی۔ یہ ایک ایسا تکلیف دہ اور غیر انسانی حکم تھا کہ مفتی نے ہمارے ساتھ مل کر اور ہمیں ورغلا بھڑکا کر اس حکم کے خلاف رٹ کرا دی تھوڑے عرصے بعد پنڈی اسلام آباد کے وہ گروہ بھی ہمارے ساتھ آکر شامل ہو گئے جن کا قلبی نسبی اور خاندانی طور پر اس گدی پر ازلی حق بنتا تھا۔ ادھر کوئٹہ کے پیر صاحب نے کوئٹہ پہنچ کر دوسرا ستم یہ کیا کہ اعلیٰ درجے کا ایک ایرانی جانماز اور سنگ پانی کی ایک مرصع تسبیح ممتاز مفتی کو بھجوا دی۔ مفتی یہ تحفے پا کر بہت خوش

ہوا اور پیر صاحب کو بذریعہ ایکسپریس تار پیغام بھجوایا کہ "جانماز مل گئی توجہ کا شکریہ۔ اب مہربانی فرما کر ایک نمازی بھی بھجوا دیں تاکہ جانماز استعمال ہو سکے۔" انہوں نے بذریعہ جوابی تار مفتی صاحب سے ان کا عہدہ اور ولایت واپس لے لی اور مفتی ہنسی خوشی لوٹ کے ہمارے درمیان آگیا ایسے خطرات سے یہ کئی مرتبہ بڑے حسن اور سلیقے کے ساتھ براور ہوا ہے اور مجھے یقین ہے کہ آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔

ممتاز مفتی اس عالم ناسوت میں احترام صرف عکسی مفتی کا کرتا ہے اور محبت قدرت اللہ شہاب سے میں اس کے نقطہ احترام سے تو اختلاف نہیں کرتا البتہ مرکز محبت پر نکتہ چینی ضرور کرتا ہوں۔ قدرت اللہ شہاب ہمارے بھی دوستوں میں سے تھے لیکن ممتاز مفتی نے ان کو ایسے مقام پر لا بٹھایا ہے کہ اب ان کی طرف رجوع کرتے ہوئے ہم سب کی ٹوپیاں گرنے لگی ہیں۔ اپنی دستار فضیلت سب کے سامنے گرتے ہوئے دیکھ کر کس کو تکلیف نہ ہوگی بھلا۔ لیکن یہ ہمای تکلیف سے بے پرواہ اور ہمارے احساس کمتری سے بے نیاز ایک ہی دھن الاپے جاتا ہے اور اس میں کسی قسم کی رخنہ اندازی برداشت نہیں کر سکتا۔ شہاب اپنے سارے قریبی دوستوں کی زندگیوں پر اثر انداز ہوا لیکن ہم سمجھدار لوگ تھے اور اپنے نفع نقصان کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ ہم جب بھی اس کے قریب گئے زرہ بکتر پہن کر گئے۔ مفتی اس معاملے میں بالکل بھولا اور احمق انسان نکلا وہ ململ کا کرتے پہن کر اس کے پاس چلا گیا اور لمبی باتوں میں مصروف ہو گیا۔ لمبی باتیں اور گفتگو کے لہرے انجمنوں، محفلوں اور اسمبلیوں میں تو بڑا مزا دیتے ہیں لیکن کسی مرد خدا کی حضوری میں خطرناک صورت اختیار کر لیتے ہیں مفتی کو یہ علم نہ تھا کہ گرو سدھی موت ہوتا ہے۔ جو کوئی بھی تسلیم کی وادی سے گزر کر مرشد کی طرف جاتا ہے وہ موت کی طرف بڑھتا ہے۔ ایسی گہری گھناؤنی اور بھسم کر دینے والی موت کی طرف کہ اس کے بعد کچھ بچتا ہی نہیں۔ دوسری موت میں تو جسم مر جاتا ہے شریر فنا ہو جاتا ہے لیکن شعور باقی رہتا ہے۔ اور آگے چلا جاتا ہے لیکن گرو کے مارے ہوئے کا سب کچھ فنا ہو جاتا ہے سب بھسم ہو جاتا ہے اس میں نہ شریر باقی رہتا ہے نہ شعور۔ کلھم فنا ہو جاتا ہے بس ایک لافانی عنصر باقی رہ جاتا ہے جو اصل ہے حقیقت ہے۔ جو ہر ہے اور کنہ ہے۔ مفتی اپنی شیخی میں اہلا گہلا بے فکر اور لاابالی انداز میں ململ کا کرتہ پہن کر شہاب کے سامنے چلا گیا اور اپنی چرب زبانی کا چلہ کھینچ کر اس کے سامنے ڈٹ گیا۔ لیکن یہ بابے لوگ بڑے چالاک اور ایسے مسک میسنے ہوتے ہیں کہ دانش کے سارے راستے روک دیتے ہیں۔ ان کو اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ دانش اور عقل کی باتوں سے تو تم سمجھ ہی جاؤ گے کہ اس میدان میں تمہاری پریکٹس کافی پرانی ہے۔ اور علم سے تو تم قائل ہو ہی جاؤ گے کہ تمہارے گھر کو صرف یہی ایک راستہ جاتا ہے لیکن علم سے قائل ہونا تمہارے اندر کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکے گا۔ تم عقلی طور پر تو معقول ہو جاؤ گے لیکن اصلی طور پر نہیں۔ سمجھ تو جاؤ گے لیکن تبدیل نہ ہو سکو گے۔ ایسے میں ان کے پاس سیواجی کا ایک چھپا ہوا فولادی پنجہ ہوتا ہے جو وہ بغلگیر ہوتے وقت عملی کرتے والے افضل خاں کی کمر میں اتار کر اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ڈھیر کر دیتے ہیں۔ اس لئے مار دیتے ہیں کہ وہ زندہ ہو جائے جو اصل ہے، جو ہر ہے اور حق ہے۔ اس لئے مار دیتے ہیں کہ ماضی سے نکل کر مستقبل کی طرف رجوع کر سکو۔ اس لئے ختم کر دیتے ہیں کہ علم اور معلوم کی جگہ لا معلوم کا گیان حاصل ہو جائے۔ خرد کی جگہ دل زندہ ہو جائے اور پھر سے دھڑکنے کے قابل ہو جائے۔ تمہارا پھر اس سے تعارف ہو جائے۔ اپنے قریبی اور قریب ترین دوست سے جس کو تم نے ازل سے بھلا رکھا ہے اور بالکل فراموش کر دیا ہے۔

اب ہم سارے ساتھی پریشان ہیں اور اپنے محبوب دوست مفتی افضل خان کا لاشہ اٹھائے پھرتے ہیں جس کی کمر میں فولادی پنجہ اترا ہوا ہے اور جس کا زخم اب بھی تازہ ہے۔ نہ ہم اسے گورنر کے پھاٹک پر یا ایوان صدر کی سیڑھیوں پر لے جا کر احتجاج کر سکتے ہیں نہ اخباروں میں بیان دے کر اس خون ناحق پر کوئی تحریک چلا سکتے ہیں اور نہ ہی اسے نہلا دھلا کر دفن کر سکتے ہیں کہ خون ابھی تک رستا ہے اور بدن میں حدت باقی ہے۔ ہمارے لئے یہ ممتاز مفتی ہماری جانوں کا ایک عذاب بن گیا ہے۔ جب زندہ تھا تب بھی عذاب تھا اور اب جب فوت ہو چکا ہے تو اور بھی عذاب بن گیا ہے۔ ہم اس سوا لاکھ کے ہاتھی کو کہاں پھینکیں؟

ریڈیو پاکستان کا مقبول ترین فیچر پروگرام

تلقین شاہ

اشفاق احمد

بیگم صاحبہ: شمیم فاطمہ۔

ہدایت اللہ: نذیر حسینی۔

تلقین شاہ

شاہ: اوے ہدایت' دھوبی تاں نہیں آیا میرے کپڑے لے کے

ہدایت: آیا تھا جی اور کہہ رہا تھا کہ آپ نے اس کے ----------

شاہ: اوھناں ماں تے میری واسکٹ نکال لیا جلدی دے کے اونٹ رنگی

ہدایت: دھوبی آیا تھا جی لیکن کپڑے نہیں لایا ------ کہہ رہا تھا کہ آپ نے اس کے ساتھ وعدہ کیا تھا پچھلا بل بھی بھجوانے کا

شاہ: کنے کیا تھا وعدہ اوہدے ساتھ؟ اوہ تاں میں کیا تھا ------ میں خود گیا تھا اوہدے تے۔

ہدایت: وہ بھی تو یہی کہہ رہا تھا جی کہ آپ نے اس کے ساتھ وعدہ کیا تھا اس کے گھر جا کر کہ آپ خود اس کا بل بھجوا دیں گے

شاہ: میں ایہ نہیں کیا تھا اوہدے نے کہ میں خود بھجوا دیواں گا اوہدا بل۔ میں تاں ایہ کیا تھا اور یہ وعدہ کیا تھا کہ میں دے کے آنواں گا اوہدا بل اوہدے گھر۔

ہدایت: پھر جی!

شاہ: پھر جی کیا نہیں جا سکیا اوہدے گھر

ہدایت: آپ مجھ سے کہہ دیتے جی۔ میں دے آتا جا کر

شاہ: ابھی تاں میرا پروگرام ای نہیں تھا اوہدی پے منٹ کرن کا

ہدایت: تو پھر آپ نے اس کے ساتھ وعدہ کیوں کیا جی

شاہ: وعدہ میں ایس کر کے کیا کہ وعدہ کرنا چاہی دا اے۔ ایہہ اک معاشرتی فریضہ اے انسان کا اور آداب اخلاق کا اک حصہ

ہدایت: تو پھر اسے پورا کرتے جی' وعدے کو

شاہ: پورا میں کیسے کردا جد اوہ اپنے عہد پر قائم ای نہیں رہا

ہدایت: وہ اپنے عہد پر کیسے قائم نہیں رہا جی

شاہ: اوہنے شادی کر دی اپنے بیٹے کی ہمارے گوالے کی لڑکی سے

ہدایت: یہ کیا بات فرما دی جی آپ نے انمل بے جوڑ

شاہ: کیوں انمل بے جوڑ کیسے ہوئی۔ سدھی تاں بات اے' اس نے کا بچے کری شادی اپنے لڑکے کی لال دین گوالے کے گھر۔

ہدایت: تو اس بات کا ہم سے کیا تعلق میرے آقا ------ اس کا بیٹا ہے' اس کا خاندان ہے وہ جہاں جی چاہے ------

بیگم: ہدایت اللہ ------ اے میاں ہدایت اللہ

ہدایت: حاضر ہوا جی بیگم صاحب

بیگم: بھئی کدھر ہو تم لوگ

ہدایت: ادھر ہیں جی پچھلے صحن میں بیگم صاحب

شاہ: اوئے اجنوں ٹرخا ارے تے کیا وازاں دے کے بلائی جا رہا ایں۔ اگر اجنیں منگ لیا کش کھان لیں توں ناں کہاں سے دئیں گا

بیگم: السلام علیکم میاں

ہدایت: السلام علیکم بیگم صاحب

شاہ: ہا کماں تے نکال چھتری ملکہ وکٹوریہ کے زمانے کی۔

بیگم: تم کو تو بھائی لوگوں کی چیزیں ایسی ہی نظر آئیں گی۔ پرانی اور دقیانوس!

ہدایت: نہیں جی یہ تو ایسے ہی کہہ رہے ہیں میرے آقا ---- مذاق کر رہے ہیں جی۔

بیگم: اچھا مذاق ہے بھئی تمہارے آقا کا جو لوگوں کا دل جلا کے رکھ دے۔

شاہ: دلاں کی اجکل کون پروا کردا اے اور میرے حساب تے کرنی بی نہیں چاہی دی

ہدایت: کیوں جی کرنی کیوں نہیں چاہیئے۔ دلوں کی پرواہ

شاہ: پروا اوس چیز کی کرنی چاہی دی اے جو قیمتی ہووے۔ بے بہا ہووے۔ نایاب ہووے۔

بیگم: تو اس سے زیادہ قیمتی شے اور کون سی ہے؟ دل سے! اسی سے تو نظام زندگی قائم ہے اور اسی کے بل بوتے پر نبض انسانیت میں توازن موجود ہے۔

شاہ: ایدھے تے زیادہ ناں پیس میکر قیمتی اے۔ ای سی جی مانیٹر قیمتی اے۔ انسان کا معدہ ہمہ گری کے قیمتی اے۔ بنک بیلنس لکھاں ہزاراں چیزاں قیمتی ایں دل کے مقابلے ماں۔

ہدایت: دل کے مقابلے میں جی!

شاہ: پہلے اور کش نہیں تاں شاعری ہندی تھی جو نے دل کے اور دل گرفتہ کے کم آجاندی تھی' اب اوبی نہیں رہی

بیگم: کیوں شاعری کو کیا ہوا ہے۔ اچھی بھلی تو ہے

شاہ: اب شاعری بی دماغ کے کم کی چیز بن گئی اے بیگم صاحب۔ دل پر کاٹ نہیں کردی۔ اب ساری شاعری معاشی اونچ نیچ اور اقتصادی گراکتی بڑھتی کی شاعری بن گئی اے

بیگم: کوئی بھی نہیں ------ ہم تو اسی کی طرح کی سمجھ رہے ہیں شاعری جیسے پہلے ہوا کرتی تھی۔

شاہ: آخری غزل کب پڑھی تھی آپ نے

بیگم: آخری غزل تو ہم نے جب پڑھی تھی جب ہم اکیلے بیٹھتے تھے اپنے کمرے میں تن تنہا------!

ہدایت: تن تنہا کیوں جی خدانخواستہ

بیگم: دلہن جب مائیوں بیٹھتی ہے ہدایت اللہ تو اکیلی ہی ہوتی ہے زیادہ تر اپنے کمرے میں۔

شاہ: ایہہ اج تے اڈاتالی برس پہلے کی بات کر رہے ہیں بیگم صاحب جب ایناں کی شادی ہوئی تھی اور جد ایناں نے آخری غزل پڑھی تھی ---- اب اوہ شاعری نہیں رہی بیگم صاحب اب اقتصادی دور اے۔

بیگم: اقتصادی دور تو اس وقت سے چلا آرہا ہے جب سے انسان اس کرہ ارض پر آباد ہوا ہے۔ یہ کوئی نئی بات تھوڑی ہے۔

شاہ: اب زمانہ آگے بڑھ گیا اے بیگم صاحب۔ پہلے زمانے ماں انسانی ضرورتاں ہو گیا کریاں تھیں اب اقتصادی ضرورتاں سامنے ہندیاں ایں۔ اور ایہ ضرورتاں ایسیاں ایں کہ ایناں کے سامنے اصل ضرورتاں شرمندہ ہو گیاں ایں۔ پہلے انسان زندگی کی خاطر زندہ اب طرز زندگی کی خاطر زندہ اے۔

ہدایت: میں تو بس ایک یہ بات کرتا ہوں جی اور ایک ہی نصیحت کرتا ہوں ہر ایک کو ---- کہ -------

شاہ: نصیحت کے ساتھ ساتھ وصیت بی کرواجا اوہدا بی وقت آیا کھڑیا اے۔

بیگم: کیسی باتیں کرتے ہو تلقین شاہ' منہ بھر کے

ہدایت: بالکل ٹھیک فرما رہے ہیں میرے آقا۔ اس کا وقت بھی آگیا ہے بلکہ میں تو کہوں گا کہ ہر وقت وصیت کا وقت ہے

شاہ: ڈرائی کیا جا رہا ایں سینوں اوس وقت کا

ہدایت: میں ڈرا نہیں جی حقیقت عرض کر رہا ہوں کہ انسان جب بھی کسی کے ساتھ وعدہ کرے سوچ سمجھ کر کرے' جب بھی کوئی عہد کرے اچھی طرح

نبھائے

شاہ: اوہ کس لئے 'اوہ کا ہے۔

ہدایت: وہ اس لئے جی کہ کیا ہوا وعدہ اگر پورا نہ کیا تو وہ گلے پڑ جائے گا۔ جان کا عذاب بن جائے گا۔

بیگم: سوچ لو میاں' تم نے بھی بڑے بڑے وعدے کر رکھے ہیں۔

شاہ: میں کد کریا اے آپ کے ساتھ کوئی وعدہ

بیگم: میرے ساتھ تو نہیں کیا بھائی لیکن اوروں کے ساتھ تو کئے ہیں تم نے بہت سارے وعدے۔

ہدایت: برہان شاہ کے ساتھ کیا ہے جی انہوں نے وعدہ' ہاشمی خاندان کے ساتھ کیا ہے وعدہ اور وہ جو ---- ایک مائی ۔

شاہ: ایسے ای نال بکواس کری جایا کر خواہ مخواہی ---- گڑے مردے اکھاڑن لگا اے۔

ہدایت: کئے ہوئے وعدے میں مدت معیاد کی بات نہیں ہوتی میرے آقا ایک نہ ایک دن یہ گلے پڑ جاتا ہے

بیگم: اور پھر ایسا گلا گھوٹتا ہے کہ دوہرا تہرا نقصان ہو جاتا ہے۔

ہدایت: یہ اپنے ہندوستان نے وعدہ کیا تھا ناں جی کشمیریوں کے ساتھ

شاہ: اوہ تاں میرا بڑا دوست اے

ہدایت: تو آپ کے اس دوست نے کشمیروں کے ساتھ وعدہ کیا کہ چند روز کی مہلت دو میں تمہارے یہاں رائے شماری کراؤں گا اور پھر جس طرح سے بھی تم فیصلہ کرو گے اس پر عمل کروں گا اور اپنے وعدے کا پابند رہوں گا۔

شاہ: اب اس بات نوں تاں چالی بیالی برہے گزر گئے نہیں کری اس نے اپنے وعدے کی پابندی۔

ہدایت: یہی تو میں عرض کر رہا ہوں جی کہ چالیس چھوڑ اگر ایک سو چالیس سال بھی گزر جائیں اور کیا ہوا وعدہ پورا نہ ہو تو وعدہ گلے پڑ جاتا ہے اور دوہرا تہرا نقصان ہو جاتا ہے۔

شاہ: اب ایسے ای نہ خوفزدہ کری جا

ہدایت: میں خوفزدہ نہیں کرتا جی۔ وعدہ گلا دبوچ لیتا ہے۔ اس کی ایک اپنی لیلا ہے وعدے کی۔

بیگم: تو وعدہ کیا کیا تھا ہندوستان نے کشمیری عوام کے ساتھ۔

ہدایت: ہندوستان نے دو نومبر سن انیس سو سینتالیس میں دنیا کی سنسار سبھا میں وعدہ کیا

شاہ: سنسار سبھا!

ہدایت: یو این او کے ممبروں کی بھری محفل میں حلفیہ وعدہ کیا کہ ہم اعلان کرتے ہیں کہ کشمیر کی قسمت اور اس کے مستقبل کا فیصلہ اس کے عوام کریں گے۔ ہماری یہ ضمانت اور ہمارا یہ قول شرف صرف جموں اور کشمیر کے عوام کے لئے ہی نہیں ہے بلکہ ساری دنیا کے لئے ہے ہندوستان اس وعدے سے نہ تو کبھی منہ موڑے گا اور نہ ہی انحراف کرے گا۔

شاہ: ایہہ اعلان کس نے کریا

ہدایت: یہ اس وقت کے وزیر اعظم نے کیا جی۔ ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت نہرو صاحب نے۔

شاہ: دیکھیا پھر میں ناں کہندا تھا۔

ہدایت: اس کے بعد انہوں نے متعدد مرتبہ اس وعدے کو دہرایا اور واضح الفاظ میں دہرایا۔

شاہ: میں اک مرتبہ فلم دیکھی تھی اونہاں کی اچکن ماں گلاب کا پھل لگایا دیا تھا میری طراں

ہدایت: ہندوستان کے وزیر اعظم نے 4 جون 1951ء میں لو سبھا میں کہا "پاکستان اس سلسلے میں جو چاہے کے لیکن ہم وعدہ کر چکے ہیں اور ہمارا یہ وعدہ کشمیری عوام کے ساتھ نہیں ہے بلکہ یونائیٹڈ نیشن کے ساتھ بھی ہے کہ کشمیریوں کو ان کا حق خود ارادی ملے گا اور ہم ان کو یہ حق دلا کر رہیں گے۔ کشمیری اپنے مستقبل کا جو بھی فیصلہ کریں گے وہی ہم کو منظور ہو گا۔

بیگم: لیکن اب کیا ہو رہا ہے' یہ بھی تو بتاؤ۔

ہدایت: اب وہی ہو رہا ہے جس کا وعدہ کیا گیا تھا ---- اب یہ تو ہو کر رہے گا بیگم صاحب

بیگم: لیکن ہم تو کچھ اور ہی سن رہے ہیں ہدایت اللہ

ہدایت: آپ چاہے کچھ بھی سنیں بیگم صاحب عوام کے ساتھ کیا ہوا وعدہ پورا ہو کر رہتا ہے۔ یہ ایک اٹل قانون ہے۔

شاہ: لیکن اب تاں وقت ای کافی گزر گیا اے۔

ہدایت: کئے ہوئے وعدے پر جتنا بھی وقت گزرے گا' وعدہ اسی قدر مضبوط ہوتا جائے گا۔ جلدی پورا ہو جائے تو فائدہ رہتا ہے دیر ہو جائے تو گلے کا پھندا بن جاتا ہے پھر اس سے رہائی نہیں ملتی۔

بیگم: تم نے تو ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا تلقین شاہ۔

شاہ: کینے؟ میں! میں کیا وعدہ کرنا تھا کسی تے 'میری کیا حیثیت اے۔

ہدایت: انہوں نے وعدہ کیا تھا جی اپنے یتیم بھتیجے سے 'میرے آقا نے۔

شاہ: میرے تے کد ملیا اے میرا بھتیجا

ہدایت: ملے یا نہ ملے۔ آئے یا نہ آئے۔ پوچھے نہ پوچھے لیکن آپ کا وعدہ موجود ہے۔

بیگم: بھئی اس نے وعدہ کیا کیا تھا اس سے۔

ہدایت: انہوں نے اپنے یتیم بھتیجے' برہان شاہ کی زمینوں پر قبضہ کر لیا تھا۔

شاہ: ایہہ تاں کئی سالوں کی بات اے۔ چالی بیالی برھے پہلے کی بات۔ اب تاں اور بڑا ہو گیا اے۔ بال بچیاں والا۔

ہدایت: میرے آقا نے گاؤں کے تمام لوگوں کے سامنے' نمبردار کی موجودگی میں' قرآن اٹھا کر وعدہ کیا تھا کہ میں اپنے یتیم بھتیجے کی ساری زمین اس کو واپس کر دوں گا۔

بیگم: تم نے قبضہ کیوں کیا اس کی زمینوں پر۔

شاہ: اوہدا والد فوت ہو گیا تھا' میرا بڑا بھائی مسکین شاہ اور میں فوری طور پر ایہی مناسب سمجھیا کہ میں اوہدیاں زمیناں سنبھال لواں حفاظت کے ساتھ

بیگم: پھر

شاہ: پھر کیا۔ میں اوہدیاں زمیناں واپس کرن کا وعدہ کر لیا پنچاں کے موہرے

بیگم: تو اب تک لوٹائی کیوں نہیں اس کی زمین

شاہ: لوٹائیاں ایس وجہ تے نہیں کہ بعد ماں اوہ بڑا ہو گیا' برہان شاہ' میرا بھتیجا ------ جوان ہو گیا۔

بیگم: یہ کیا بے تکی بات کر رہے ہو۔ جوان ہو گیا تو اس کا حق ختم ہو گیا اپنی جائیداد پر۔

شاہ: نہیں حق تاں ختم نہیں ہوئیا لیکن اوہ بڑا کاہتے ہوئیا۔ جوان کیوں ہوئیا۔

ہدایت: سن رہی ہیں جی آپ ان کی منطق

شاہ: میری منطق تاں سدھی اے اور میں قیم ایں اپنے وعدے پر اور اپنے اقرار پر۔

بیگم: وہ کس طرح؟

شاہ: اوہ اس طراں بیگم صاحب کہ میں سارے پنڈ کے سامنے اور نمبردار کی موجودگی ماں اعلان کریا تھا کہ برہان شاہ کیاں زمیناں قبضے ماں ایں اور اوہ ایدھی ملکیت ایں ایدھی جائیداد ایں۔ ایہ چھوٹا اے اور ناسمجھ اے اور بالک اے میں ایدی جائیداد کی بہتر طور پر نگہداشت کر سکداں ایں۔ لیکن میرا عہد اے ایدھے ساتھ اور آپ سب کے ساتھ کہ میں ایدی جائیداد کا اک اک انچ واپس کر دیاں گا۔

ہدایت: پھر جی

شاہ: پھر ایہ کہ اوہ بڑا ہو گیا' جوان ہو گیا اور اپنے وعدے تے پھر گیا۔

بیگم: وہ اپنے وعدے سے پھر گیا کہ تم پھر گئے!

شاہ: دیکھو جی میں اپنے وعدے ماں کہا تھا کہ برہان شاہ چھوٹا اے اور ناسمجھ اے اور بالک اے' میں ایدھیاں زمیناں موڑ دیاں گا بلکہ اوہ چھوٹا اور ناسمجھ اور بالک نہ رہا' جوان ہو گیا پورا مرد بن گیا تاں پھیرا اپنے معاہدے کی خلاف ورزی کری یاں میں۔ اب میں اوہدی جائیداد اوہدیاں زمیناں ------

ہدایت: کل وہ آئے تھے جی برہان شاہ صاحب جیپ میں سوار ہو کر اور کلاشنکوف لے کر اور پوچھ رہے تھے میرا چاچا کدھر ہے؟

شاہ: اوھنوں ہاشمیاں نے بھڑکایا ہوتا ایں۔ گراہڈ میں اہنوں سکھلایا ہوتا ایں۔ پڑوسیاں نے ورغلایا ہوتا ایں۔ میںنوں بچا ہدایت۔ میری مدد کر اوھنیں میںنوں مار دینا اے اور اپنی جائیداد لی واپس لے لینی اے۔ بیگم صاحب میری مدد کرو' میری سہائتا کرو ------ میری حفاظت کرو ------
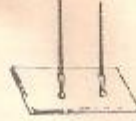
پنجابی نظماں

اشفاق احمد

○

بُت کریلے دھاگے بدھے ، سوہنے پکے

روٹی دیسی کنک دی تندوروں لتھی

اِک جگ ٹھنڈی پتلی لسّی

وِچ ٹُنگ دی ڈلی برف دی ــــ وڈی ساری

اِک سرہانا ، واہ وا لِسا

دوہرا تیہرا ہووَن جوگا

فُل سپیڈ تے سیلنگ فَین کیپیٹر ٹائپ

بُشرٹ ہُن لاہ دیاں تے رہن دیاں بنیان

فَبِاَیِّ اٰلاۤءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰن

○○○

○

اوکھا گھاٹ فقیری دا ، بھئی ! اوکھا گھاٹ فقیری دا

مسلاں دے وچ ویلا کڈھنا ، میٹنگ دے وچ بہنا

اوکھیاں دے نال متھالا کے ، یس سر ! یس سر ! کہنا

ہسدے ہسدے رہنا

اپنی سیٹ تے عاجز بن کے اُگّے ہو کے بہنا

مُرشد موہرے گل نہ کرنی ، جو آکھے سو سہنا

دنیا داری کم نئیں ، ایہہ کم ہے پتّا چیری دا

اوکھا گھاٹ فقیری دا

○○○

○

میرے دِل دے کاٹھ گدام وچ
وڈے وڈے پھٹّے
چھوٹے چھوٹے بالے
وِنگیاں ٹیڈھیاں کڑیاں
گو بنّھن دے رَسّے
پچّے ٹین کنستر
سارے دُکت نال کالے
ایہناں دے وِچکار
چنن دی اِک کُرسی
شیشیاں نال جڑی
تیریاں راہواں تکّے
دُھوڑاں نال بھری

○○○

○

جے میں کالی لُس لُس کردی
مینھ دے اُتّے بہہ کے
ہتھ وچ گنّا لے کے
گل وچ گانی پا کے
دل وچ ڈھولا گاندا
تیرے بُوہے آندا
کردی میںنوں پیار ؟
دیکھ ! اشارہ بدل گیا اے
ہولی کرلے کار

○○○

محشر بدایونی

انساں ہی کیا ستم ہیں پرندوں کی جان پر
شعلے زمین پر ہیں۔ دھوئیں آسمان پر

ہوتیں وہ کاش عدل پسندوں کے دل میں بھی
جو دَرد مندیوں کی پڑیں باتیں زبان پر

خارا شگافیوں کی مُہم سہل ہے کوئی
خود تیشہ زن ہی تھک کے گرے ہیں چٹان پر

کچھ یوں چراغ جلتے ہی خوفِ ہوا ہے اب
شام آئی اور چھا گئی وحشت مکان پر

تم اَمن کے امیں ہو تو اے مُنصفینِ عصر
کیوں وحشتیں محیط ہیں سارے جہان پر

کشتی طناب گیروں کی ہمّت سے ہے رواں
زورِ ہوا بھی کم تو نہیں بادبان پر

کیا کَیا اُٹھائے میں نے کٹھن وقت کے عذاب
لیکن نہ حرف آنے دیا اپنی آن پر

جو گردشوں میں چھوڑ کے مجھ کو چلا گیا
کتنا مجھے بھروسا تھا اُس مہربان پر

ہوتی ہے خونِ دل سے کشید رحیقِ فنّ
بکتی نہیں یہ جنس کسی بھی دکان پر

اختر ہوشیار پوری

صحیفے حرف و نوا کے قلم پہ اُترے ہیں
مگر یہاں کے جو دُکھ ہیں وہ ہم پہ اُترے ہیں

سمندروں کے سفر پر جو لوگ نکلے تھے
وہ اب ترے کے تو مری چشمِ نم پہ اُترے ہیں

زمیں کو اپنے ہی محور کے گرد گھومنا ہے
کہ طائرانِ حرم پھر حرم پہ اُترے ہیں

خود اپنی ذات کی پہچان بنتے جاتے ہیں
وہ میرے خواب جو اربابِ غم پہ اُترے ہیں

یہ کون لوگ ہیں یارو جو مکھیوں کی طرح
امیرِ شہر کے خوانِ کرم پہ اُترے ہیں

خزا کی زردی عارض لہو کی فصلِ بہار
پیمبری کی طرح رنگ ہم پہ اترے ہیں

ہمیں تو دُھوپ سے فرصت نہیں ملی اختر
یہ اندھے سائے کسی محترم پہ اُترے ہیں

○

مسعود قریشی

روز ملنا ہے جو دشوار تو ایسے ہی سہی
تم کو فرصت نہیں سرکار تو ایسے ہی سہی

یار کو چاند بنانے کا ہُنر رکھتے ہیں
گُل ہوئی مشعلِ دیدار، تو ایسے ہی سہی

یوں تو منبر سے بھی اعلان ہوا ہے حق کا
شرط ٹھہری ہے جواب دار، تو ایسے ہی سہی

ہم بھی رُکنے کے نہیں، وقت کی رفتار ہیں ہم
آپ ہیں راہ کی دیوار، تو ایسے ہی سہی

اُس کا چہرہ ہے ستاروں میں، صبا میں خوشبو
بند ہے کوچہ دلدار، تو ایسے ہی سہی

پرتو روہیلہ

میرا پندار کہاں خوفِ خدا سے ٹوٹا
یہ وہ بت تھا کہ فقط گرز قضا سے ٹوٹا

نظمِ گلشن سے لیا جائیگا کل اس کا حساب
کوئی پتہ بھی اگر تیز ہوا سے ٹوٹا

منتشر آج بھی ہے روئے زمیں اُس کا وجود
وہ ستارہ کہ جو دنیائے خلا سے ٹوٹا

یوں لگا جیسے ابھی تو نے پکارا مجھ کو
جبرِ ماحول تری ایک صدا سے ٹوٹا

تُو ہے پہلو میں تو لگتا ہے یہ ماہِ تاباں
ایک تنکہ تری زرتا رقبا سے ٹوٹا

اب تو عرصے سے دریچے پہ وہ دستک بھی نہیں
ایک رشتہ تھا چلو وہ بھی صبا سے ٹوٹا

کس نے پھر عکسِ رخِ یار سنوارا پرتوؔ
آئینہ دل کا مرے کس کی رضا سے ٹوٹا

سیدہ رابعہ تہاں

سکوں کا لمحہ کوئی میری عمر بھر میں نہیں
وہ زندگی ہی بھلا کیا کہ جو بھنور میں نہیں

بہاؤں اشک تو بہہ جائیں بستیاں ساری
غلط کہ اشک مری چشمِ معتبر میں نہیں

وہ آئے کیا کہ فضائیں بھی جگمگا اُٹھیں
یہ روشنی ہے کہ ایسی رُخِ قمر میں نہیں

خلوص اور محبت ہے میرا سرمایہ
وگرنہ رُوح کی تسکیں، زر و گہر میں نہیں

خیال و فکر کی شمعیں جلائی ہیں میں نے
یہ اور بات دیا میری رہ گزر میں نہیں

بلند و پست کہ یہ انتخاب ہے اپنا
صفت ہے کونسی جو دامنِ بشر میں نہیں

چراغ مہر و وفا کے جلائے خوشی سے تہاں
اب اس کے بعد کوئی روشنی نظر میں نہیں

○

پروین کمار اشک

(پٹھان کوٹ بھارت)

ہے کوئی مجھ سا زمیں دار سامنے آئے!
اُگاؤں پھول تو تلوار سامنے آئے!

مرے وجود کی مٹّی ہے کان سونے کی
ہے کوئی میرا خریدار سامنے آئے!

گرا چکا ہوں جو دیوار اپنے ہاتھوں سے
نہ جانے کیوں وہی دیوار سامنے آئے!

بڑوں سے کرنے لگوں جب کبھی میں گستاخی
مرے بزرگوں کی دستار سامنے آئے!

کسی نے شہر کے بونوں کا کھیل اے بچّو!
جو دیکھا ہے مزے دار سامنے آئے!

جوان آئینے میں اپنی شکل جب دیکھوں
تو کوئی چہرۂ بیمار سامنے آئے!

"میرے خدا! تری مخلوق سب سلامت ہو"
دُعا یہ مانگوں جب اخبار سامنے آئے!

میں شہر شہر میں اعلان کر رہا ہوں اشک
ہے کوئی صاحبِ کردار سامنے آئے!

راشد ملیزئی

اپنی پلکوں میں مجھے تُو نے چھپا رکھا ہے
شکر ہے گردشِ دوراں سے بچا رکھا ہے

ظلم اِنسان پہ انساں نے روا رکھا ہے
اہلِ ثروت کو خدا سب نے بنا رکھا ہے

میرے لٹنے سے کہاں شہر پہ محشر ٹوٹا
شہر والوں نے تو اِک جشن بپا رکھا ہے

ایک وہ ہیں کہ مجھے آنکھ کا کانٹا سمجھیں
ایک میں ہوں کہ انہیں دِل میں بسا رکھا ہے

تُو نہیں ہے تو ترے لَمس کی مہکار تو ہے
دِل کا ویرانہ بہر طور سجا رکھا ہے

ہم کسی چیز میں قائل نہیں آمیزش کے
غمِ دنیا سے تیرے غم کو جُدا رکھا ہے

آخر اِنسان ہیں، مجبور ہیں، تھک سکتے ہیں
اپنی نظروں کو تو راشد نے بچھا رکھا ہے

○○○

افضل گوہر

ہوا کو حبس کی رُت میں کہاں درکار ہونا تھا
درختوں کو ابھی کچھ اور سایہ دار ہونا تھا

مسافر کو نجانے کس لئے جلدی تھی منزل کی
ابھی کپڑے بدلنا تھے ابھی تیار ہونا تھا

انا تک بات آپہنچی تھی قامت کے تحفظ کی
اگر میں سر نہ کٹواتا تو بے دستار ہونا تھا

امیرِ شہر چالاکی سے استحصال کرتا ہے
غریبوں کو وگرنہ شہر کا سردار ہونا تھا

اندھیروں سے رہا ہوتے تو ہم وہ کور دیدہ تھے
اُجالے کے لئے سورج جنہیں درکار ہونا تھا

ہماری کشتیاں ہی ڈوبنے کو تھیں تو ایسے میں
کسی بہتے ہوئے تنکے کو کب پتوار ہونا تھا

مجھے معلوم تھا گوہر مرا دشمن کمینہ ہے
اگر میں ہارتا تو پشت پر بھی وار ہونا تھا

○○○

تحفۂ مرگ

ڈاکٹر سید شبیر حیدر
(آسٹریلیا)

ایک سات سالہ بچہ مرنے لگا تو اس نے اپنے
باپ سے کہا
سب بچوں کو قدرت نے
ہنسی خوشی کے پھول دیئے
رنگوں اور خوشبوؤں کا جوڑا پہنایا
لیکن پیارے ابو جان!
میں نے اپنی پیدائش پر
بیماری کا
"ایڈز" سی موذی بیماری کا تحفہ پایا

○

میری قسمت
جسم اور روح میں
دکھ کے زخم اور کانٹے کنکر لے کر چلنا
پیہم اپنی آگ میں جلنا
(میں کہ جنم کا روگی بچہ)
پیارے ابو!
آپ کے پیار کا کومل سایہ
میری قسمت میں کب آیا

○

پیارے ابو! میں جب وادیٔ مرگ میں اتروں
ابد سرا میں اپنے ازلی گھر کو جاؤں
میں مر جاؤں!
میری قبر کی ڈھیری پر تم
تلسی کا ایک پیڑ لگانا
دنیا میں خوشبو پھیلانا
اپنے شہر کے کوچوں، گلیوں، میدانوں میں
رنگ لٹانا
شہر کی روح کو
صحت والی خوشیوں کا سرمایہ دینا
شہر کے جسم کو ایک سہانی کایا دینا
میری یاد میں!
دھوپ میں جلتے انسانوں کو سایہ دینا

—○—

نظمانے

عظیم راہی

سیلز مین

رحمتے!

—— سامنے کی دُکان پر تو دیکھ
اُس ہرے سوٹ والی لڑکی نے
کیا قیامت کا حُسن پایا ہے!
جی میں آتا ہے یار کیا کیا کچھ!
—— نیل پالش کولون، آئی شیڈ
کہیئے کیا چیز چاہیئے "باجی"!

لمحہ فکریہ

—— مجھ کو حیرت ہے مولوی صاحب
آپ ٹیلی وژن خریدیں گے!
تُم ہی بتلاؤ کیا کروں بیٹے
بچیاں اس کو دیکھنے کے لئے
دوسروں کے گھروں میں جاتی ہیں!

"ٹریفالگر سکوئر"

شگفتہ نازلی

چاروں اور مجسّمے ہیں
اور قدیم عمارتیں بھی
ہے تاریخ رقم اُن پہ
وہ بذاتِ خود گویا
فوّاروں کی موسیقی
جیسے بجتے جلترنگ
اور سفید کبوتر جو
دانہ چگتے اڑتے پھرتے
امن و سکوں کے تمنائی
اور آنے والوں کے لئے
اک خنکی سی فضا میں رچی
عکس پہ عکس اُترتے ہوئے
اپنی پسند کا پس منظر
بچھڑے دوست یہاں ملتے ہیں
پھر ملنے کو بچھڑتے ہیں
کیونکہ یہ ٹریفالگر ہے

محمد افسر ساجد

شام کے سائے بڑھے، بڑھتے رہے
درد کے سورج چڑھے، چڑھتے رہے

تیرے ہر غم کو غمِ جاں، جان کر
اپنے ہر غم سے لڑے، لڑتے رہے

ہجر کی شب تیری یادوں کے دیے
مثلِ گلناراں جلے، جلتے رہے

شوخیِ فطرت، گلوں کی ناز کی
کیسے کیسے بُت ڈھلے، ڈھلتے رہے

ہم بھی ساجدؔ زیست کی تنہائی میں
اپنی وحشت سے ڈرے، ڈرتے رہے

کاروانِ صدا

رشتے ٹوٹے ہی تھے
جب وہ تنہا ہوا
اور پھر مرگیا ــــــ
لاتعلق رہا زندگی سے سدا
اور معلّق رہا
جسم اور روح کی خواہشوں کے میاں
روح تو مضطرب
جسم کی چپ بھی محلول ہوتی رہی
چاہے جانے کی خواہش
مسلسل صدائے پسِ مرگ بن کر ابھرتی رہی
پائے جانے کا غم
پا نہ سکنے کا غم
کاروانِ صدا، ناشناسی کے انبوہ میں گم ہوا ــ
"ہے" وہی جو بظاہر
نہیں ہے یہاں
جاں کے آزار کا، ہم سفر کون ہے
وصل کے خواب کا، منتظر کون ہے!!

مالک رام

پاکستان کے ضلع گجرات کے ایک کھتری گھرانے میں 22 دسمبر 1906ء کو ایک ہونہار بچہ پیدا ہوا۔ والدین نے اس کا نام "مالک رام" رکھا۔ بڑا ہو کر یہی بچہ دنیائے ادب میں اردو کے ایک ممتاز محقق اور ماہر غالبیات کے نام سے مشہور ہوا۔

مالک رام کی ابتدائی تعلیم ضلع گجرات کے موضع پھالیہ کے گوردوارے میں ہوئی۔ پہلے گرمکھی سیکھی اور پھر ایک ایسے اسکول میں داخل ہوئے جہاں اردو بہ التزام پڑھائی جاتی تھی اور ان کے دوست اور ہم سبق مسلمان تھے۔ یہیں سے ان کے ذوق ادب اور مذاہب کے تقابلی مطالعے کی بنیاد پڑی۔ لاہور

ممتاز محقق ماہر غالبیات اور صف اول کے خاکہ نگار

مصباح العثمان

میں کالج کی تعلیم کے دوران ان کی پہلی تحریر ماہنامہ "نیرنگ خیال" کے 1924ء کے کسی شمارے میں شائع ہوئی۔ یہ رابندر ناتھ ٹیگور کی تصنیف "گیتا نجلی" کے ایک ٹکڑے کا ترجمہ تھا۔ بی۔ اے کرنے کے بعد مالک رام نے ملازمت کا آغاز صحافت سے کیا تھا۔ 1932ء سے 1936ء تک مختلف جرائد ہفت روزہ "آریہ گزٹ" ماہنامہ "نیرنگ خیال" اور روزنامہ "بھارت ماتا" لاہور میں بحیثیت ایڈیٹر کام کیا۔ پھر حکومت ہند کی ملازمت اختیار کی۔ دوسری جنگ شروع ہونے سے کچھ عرصے پہلے ان کا تبادلہ مصر ہو گیا اور جنگ چھڑ جانے کی وجہ سے ایک طویل عرصے تک مشرق وسطی ہی میں رہے۔ اور اس سلسلے میں انہیں یورپ کے کچھ ممالک میں بھی قیام کا موقع ملا۔ وہاں انہوں نے کئی بڑی زبانوں سے واقفیت حاصل کرلی۔ برسوں عرب ممالک میں کام کرنے سے انہیں عربی زبان پر عبور حاصل ہو گیا۔ وزارت خارجہ کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد 1965ء میں ہندوستان واپس آئے اور دہلی میں سکونت پذیر ہوئے۔

مالک رام کی طبیعت میں شروع ہی سے تلاش و جستجو تھی اور اسی تلاش و جستجو نے انہیں دنیائے ادب میں نقاد، محقق، ماہر غالبیات کی حیثیت سے روشناس کرایا۔

1926ء کے "نگار" میں ان کا پہلا تحقیقی مضمون "ذوق اور غالب" کے عنوان سے ان کے طالب علمی کے زمانے میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں زبان و بیان کے لحاظ سے ذوق کو غالب پر ترجیح دی گئی تھی۔ اور آخر تک ذوق کے بارے میں ان کی یہی رائے تھی۔ اس کے بعد انہیں غالب سے زیادہ دلچسپی پیدا ہو گئی اور یہ دلچسپی اتنی بڑھی کہ بعد کو انہوں نے غالب کے ساتھ ہی تمام زندگی بسر کی۔ غالب پر انہوں نے ایسا اعلی تحقیقی کام کیا کہ غالب شناسوں میں ماہر غالبیات مشہور ہو گئے۔

سوانحی تحقیق پر خاص طور سے مالک رام کی کتابیں "ذکر غالب" اور "تلامذہ غالب" اتنی اہم اور معتبر ہیں کہ غالب کی دوسری معروف سوانح عمریاں یعنی حالی کی "یادگار غالب" اور مولانا غلام رسول مہر کی غالب اور شیخ اکرام کی "غالب نامہ" کے ساتھ ساتھ "ذکر غالب" کو بھی مطالعہ غالب کیلئے ناگزیر سمجھا گیا۔ مالک رام نے نہایت مدلل نثر اور شگفتہ زبان میں غالب کی زندگی کے حالات تحقیق و تلاش کے بعد "ذکر غالب" میں پیش کئے۔ یہی کتاب مالک رام کی غالب شناسی کی شہرت کا نقطہ آغاز بھی ہے۔

سوانحی تحقیق ہی کے ضمن میں تذکرہ معاصرین جو چار جلدوں میں ہے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں 1967ء سے 1977ء تک وفات پانے والے اہل ادب کے حالات نہایت دلچسپ اور دلنشیں انداز میں لکھے گئے ہیں۔

مالک رام کے ایک اردو ترجمے کا ذکر ضروری ہے کہ جو 33ء کے "نیرنگ خیال" میں شائع ہوا تھا۔ یہ ڈاکٹر نکلسن کے مقالے کا اردو ترجمہ ہے جو

"اسرار خودی" کے متعلق تھا۔ ترجمے کو حواشی سے بھی مزین کیا گیا تھا۔ یہ ترجمہ علامہ اقبال نے دیکھا تو بہت پسند کیا اور مترجم سے ملنے کی خواہش ظاہر کی اور اس طرح مالک رام کی علامہ اقبال سے پہلی ملاقات ہوئی۔

مالک رام کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ وہ صرف تحقیق کے مرد میدان ہیں۔ لیکن "وہ صورتیں الٰہی" کے نام سے انہوں نے جو دس خاکے لکھے ہیں وہ اعلیٰ درجے کی تخلیق ہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"ان خاکوں کو فن خاکہ نگاری میں وہ اہمیت ہے جو مزاح نگاری میں پطرس کے آٹھ دس مضامین کی ہے یہ خاکے اردو خاکوں میں نہ صرف اہم ترین اضافہ ہیں بلکہ فن خاکہ نگاری کو ایک نئی سمت سے بھی آشنا کرتے ہیں۔ خاص طور سے مالک رام نے غالب کا جو خاکہ لکھا ہے وہ اپنے انداز کا اردو میں پہلا خاکہ ہے بلکہ کامیاب ترین خاکہ ہے۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ غالب کی وفات کے تقریباً سو سال بعد یہ خاکہ لکھا گیا ہے۔ یہ خاکہ اتنا دلچسپ اور مکمل ہے کہ اردو میں اس کی کوئی اور مثال نہیں ملتی۔"

مالک رام کا ابتدائے شباب ہی سے مسلمانوں سے قریبی میل جول رہا۔ "نگار" کے مطالعے سے قرآن شریف اور اسلام سے دلچسپی پیدا ہو گئی اور ایک مولوی سے قرآن شریف پڑھا۔ عربی کی شدبد ہو جانے کے بعد قرآن کی تفسیر اور حدیث کا مطالعہ کیا اور اس مطالعے کے نتیجے میں دو کتابیں "عورت اور اسلام" اور "اسلامیات" لکھیں۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی نے ان کی ثانی الذکر کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ مصنف کا علم حدیث تبصرہ نگار سے کہیں زیادہ ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ نہایت اعلیٰ درجے کی معلوماتی کتابیں ہیں اور یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بیک وقت ادب اور علم دونوں کا ذوق و شعور رکھتے تھے اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنی ایک لڑکی کا نام بشریٰ اور بیٹوں کے نام آفتاب اور سلمان رکھے خاندان کے لوگوں کے اظہار تعجب پر کہا کہ میرا نام بھی تو والدین نے مالک رام رکھا ہے۔

مالک رام نے اردو کا ایک معیاری مجلّہ "تحریر" بارہ سال تک شائع کیا۔ اس مجلّے میں ایسا کار آمد مواد ہے جو آئندہ ریسرچ کرنے والوں کی رہنمائی کرتا رہے گا۔ اس رسالے کے متعدد خاص نمبر شائع ہوئے۔ جن میں غالب نمبر، جگر مراد آبادی نمبر، سید مسعود حسین ادیب رضوی نمبر، سیدین نمبر، ل احمد اکبر آبادی نمبر، رشید احمد صدیقی نمبر بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس طرح مالک رام نے اپنے ہمعصروں پر بھی خاص نمبر شائع کر کے اس کلئے کو غلط ثابت کر دیا کہ محققین گور کن ہوتے ہیں اور صرف متقدمین مرحومین سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے مالک رام کو ریٹائر ہونے کے بعد ساہتیہ اکادمی میں مولانا ابوالکلام آزاد کی تصانیف کی از سر نو ترتیب و تدوین کا کام انہیں سونپا وہاں انہوں نے مولانا آزاد کی تصانیف کی ترتیب و تدوین کی۔ جن میں غبار خاطر، تذکرہ و خطبات آزاد اور ترجمان القرآن کی آخری دو جلدیں خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ آج کل وہ مولانا آزاد کے خطوط مرتب کر رہے تھے۔ جس کی پہلی جلد شائع ہو چکی ہے اور دوسری زیر طبع ہے مولانا آزاد پر ان کی آخری کتاب "نثر ابوالکلام آزاد" ہے جو مولانا آزاد کی تحریروں کا انتخاب ہے یہ گزشتہ سال شائع ہوئی تھی۔ مالک رام کی آخری کتاب "حمورابی" اور "بابلی تہذیب و تمدن" جو ان کی وفات سے چار ماہ پہلے شائع ہوئی۔

انگریزی میں غالب اور حالی پر مالک رام کے لکھے گئے کتابچے بہت مقبول ہوئے۔ ان کے علاوہ بیسوں تراجم اور مختلف مضامین ہیں۔ غالب سے متعلق مضامین کے دو مجموعے "فسانۂ غالب" اور "گفتار غالب" شائع ہو چکے ہیں۔ دوسرے ادبی مضامین کو اگر یکجا کیا جائے تو کئی مجموعے شائع کئے جا سکتے ہیں۔

مالک رام روشن خیال" وسیع القلب اور ہر قسم کی تنگ نظری اور تعصب سے پاک تھے۔ بقول پروفیسر مختار الدین احمد "انہوں نے اردو میں تحقیق کی اہمیت کو واضح کرنے اور نوجوانوں میں ذوق تحقیق عام کرنے کے سلسلے میں جو خدمات انجام دیں وہ فراموش نہیں کی جا سکتیں"

مشاعراتی سفر

کل سے ہمارا مشاعراتی سفر شروع ہو رہا ہے۔ پہلا پڑاؤ ------ "ڈیٹرائیٹ" (DETRIOT) جس کو ہم آئندہ ----- "قانون ضرورت" ------ کے تحت لکھا کریں گے۔ کئی شہروں میں جانا ہے۔ کوئی ایک مہینے کے بعد ڈینور میں واپسی ہوگی۔ اسے کہتے ہیں سفر در سفر۔ حمیرا بی بی نے بتایا کہ "ڈیٹ رائیٹ" ---- ایئر پورٹ پر جناب سردار علی انصاری ہمارے منتظر ہوں گے۔ ایک وحشت انگیز خبر یہ سنائی کہ راستے میں "پٹس برگ" (PITS BERO) میں طیارہ تبدیل کرنا ہوگا۔ گھبراہٹ میں ہم نے دوچار صلواتیں امریکہ کو سنا دیں کہ کتنا بڑا ملک ہے جہاں اندرون ملک آمدورفت میں بھی ہوائی جہاز بدلنا پڑے۔ اقتان نے تسلی دی کہ آپ کے ساتھ کونسا بھاری سامان ہوگا۔ مگر ہم تو ٹھہرے ان لوگوں میں جو پریشانی کا جواز خود پیدا کر لیتے ہیں۔ ایک اور پریشانی اقتان نے پیدا کر دی کہ وہ ہمارے لئے برف پر چلنے والے لمبے "گم بوٹ" خرید لایا۔ ہمیں ان کی شکل ہی سے خدا واسطے کی چڑ تھی۔ پہننے پر پاؤں کا جو حال ہوا اس پر سر پیٹ کر رہ گئے۔ یوں محسوس ہوا کہ پاؤں تو چل رہے تھے مگر "ٹانگ" -------- "جام" ہو گئی تھی۔ خیر ڈھیلے چڑے سے امید ہے کہ ----- کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں۔

ڈیٹ رائیٹ" ------ "مشی گن" ریاست کے اندر یا قریب واقع ہے۔ ہمارے عزیز دوست (اور پاکستان کے ممتاز سیاسی رہنما اور دانشور راجہ حسن اختر مرحوم کے فرزند ارجمند) کرنل سلطان ظہور اختر کی بیٹی نائلہ بھی' جو اردو زبان کے صاحب طرز غزل گو شاعر سراج الدین ظفر کے بیٹے ڈاکٹر طارق سے بیاہی ہوئی ہے' مشی گن میں ہوتی ہیں۔ کیا اچھا ہو اگر ان لوگوں سے ملاقات ہو جائے۔

ایرانی کبابیہ

شام کے کھانے پر فاطی جان ہمیں ڈینور کے مشہور طعام خانہ ----- "سائرس" ------ میں لے گئیں۔ یہ ریستوران شہر کے قلب ----- (DOWN - TOWN) کے ایک کشادہ چوک میں ملک ملک کے "طعام خانوں" کی ایک وسیع اور رنگا رنگ کہکشاں کے اندر واقع ہے۔ کھانا ایک ملک کا کھاؤ خوشبو دس دوسرے ملکوں کی سونگھ لو۔ ایرانی مطعم کی بغل میں "میکسیکو ریستوران" کی چاٹ پر گاہکوں کا ہجوم ٹوٹا پڑ رہا تھا۔ "سائرس" کے ---- "تکہ کبابوں" کی پورے امریکہ میں دھوم تھی۔ کیلی فورنیا تک کے "چٹورے" خوش خورے سائرس کے کباب کھانے جمعہ اور ہفتہ کی شام ڈینور کے اس عظیم ---- "کلبہ خوراک" میں مناتے ہیں۔ اس وقت بھی شائقین کی خاصی بھیڑ تھی۔ لوگ کبابوں کو براہ راست سیخوں سے گھسیٹ گھسیٹ کر کھانے لگتے جس پر ان کو خانساموں کی خشونت بھری نگاہوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا۔ "رئیس کبابیہ" ------ آقائی تمیم داری کے فن کا یہاں وہی شہرہ ہے جو ایک زمانے میں کوئٹہ میں -(--- "لال کبابیہ" کا تھا

"سائرس" سے واپسی پر شہر کے ایک مصروف کئی منزلہ عمارتوں کے کاروباری مرکز ------ "مال مارٹ" سے بھی ہوتے آئے کوئی رونق سی رونق تھی۔ رات کو بھی دن کا سماں تھا۔ خریداروں کا آپس میں کھوے سے کھوا چھلتا دیکھا کچھ کھوا ہمارا بھی چھل گیا۔ دوکانداروں میں تزئین کا خصوصی اہتمام کیا گیا تھا کہ "کرسمس کے استقبال کی تیاریاں ابھی سے شروع ہو گئی ہیں۔ روشنیاں زمین سے اٹھ کر آسمان تک جا

رہی تھیں۔ اسی طرح اشیا کی قیمتیں بھی آس پاس کشادہ "موٹر پارک" اور کئی منزلہ ----- "موٹر خانے" موجود تھے پھر بھی ہمیں موٹر کھڑی کرنے کی جگہ کئی فرلانگ کے فاصلے پر جا کر ملی۔ لگتا تھا کہ سارا شہر ----- "شاپنگ" پر نکلا ہوا تھا۔

(5 نومبر)

بچے کی تاکید

صبح کو ----- حسب معمول ----- ماؤ ضیار کو "بس" تک پہنچانے گیا تو وہ ہمیں سفر کے بارے میں محتاط رہنے کی تاکید کرتا رہا۔ کہنے لگا ----- "دادا" نیویارک میں اچکے لوگ مسافروں کو دن دہاڑے بازار میں راہ چلتے لوٹ لیتے ہیں۔ دادا نیویارک میں آپ کو بہت چوکس رہنا ہوگا۔ دادا اپنے "بریف کیس" کو مضبوط پکڑے رکھنا ----- بس چلنے پر آج ماؤ ضی نے ہمیں معمول سے زیادہ بوسے دیئے۔ ساتھ ساتھ کہتا جاتا ---- "دادا جی آئی لو یو" (DADA I LOVE YOU) ----- ہمارا جی تو سفر سے پہلے ہی بوجھل ہو گیا۔

کارِ خیر

ہمیں معلوم نہ تھا کہ ہمارے "گارڈن کورٹ" کے باشندوں نے بھی ایک فلاحی سوسائٹی قائم کر رکھی ہے رکنیت کا چندہ دس ڈالر ماہوار ہے آج صبح امتنان اور ماری ہمیں سوسائٹی کی ایک "ملن تقریب" میں اپنے ساتھ لے گئے۔ چائے پی گئی۔ لبالب بھرے ہوئے دو "ٹرک" پرانے گرم کپڑوں کے صومالیہ کے پناہ گزینوں کو بھجوائے گئے۔ مزید کپڑوں کے عطیات کے لئے ممبروں سے اپیل کی گئی ----- پرانے کپڑوں کے ڈھیر دیکھ کر ہمیں اپنے لنڈا بازار لاہور اور راجہ بازار راولپنڈی میں "پرانے کپڑوں" کے بیوپار کی گرم بازاری یاد آتی رہی۔ ایک "کوٹ" کو تو دیکھ کر سید محمد جعفری کی مشہور نظم "پرانا کوٹ" ----- کا یہ مصرع یاد آگیا۔

کسی مرے ہوئے گورے کی یادگار ہے یہ

ویسٹ رائیٹ کی طرف

پونے چار بجے کی "پرواز" پکڑنے کے لئے ہم تین بجے گھر سے نکلے۔ ماؤضی کو "اٹھانے" اس کے اسکول پہنچے۔ بچے کلاسوں سے نکل ہی رہے تھے استانیاں اپنی نگرانی میں بچوں کو "بسوں" میں بٹھا رہی تھیں۔ ماری کو میں نے "جاب" پر سے آنے کو منع کر دیا تھا۔ امتنان جہاں آرا اور ماؤ ضی مجھے ایئر پورٹ کے اندر اس دروازے تک چھوڑ گئے جو ہمارے طیارے کے اندر کھلتا تھا۔ "ایئر پورٹ" پر مسافروں کی جانچ پڑتال ہوتی تو ہوگی مگر ان کو "ٹٹولا ٹٹولا" نہیں جاتا۔ مشینوں کی آنکھیں بہت تیز ہیں۔

برفباری صبح سے جاری تھی۔ پرواز میں تاخیر و تعطل کا احتمال تھا۔ مگر صرف پندرہ منٹ کی تاخیر ہوئی۔ وہ بھی برف کے باعث نہیں ایک معمر خاتون مسافر کی طبیعت کی خرابی کے باعث۔ ڈیور کا ایئر پورٹ لندن کے "ہیتھرو" سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ اور نیا بھی کہ برطانیہ تاریخ ہی تاریخ ہے اور امریکہ تعمیری تعمیر ہے طویل اور کشادہ مہمان گاہ طیاروں سے بھری ہوئی تھی۔ کچھ طیارے بھاگ رہے تھے' کچھ کھڑے تھے۔ کوئی اتر رہا تھا' کوئی چڑھ رہا تھا۔ "یو ایس ایئر لائن" --- جس پر ہم سفر کر رہے تھے ---- نسبتاً ایک چھوٹی کمپنی ہے۔ پھر بھی اس کے پچاس طیارے روزانہ ڈیور سے مختلف اطراف کو جاتے ہیں۔ ہوائی جہاز متوسط گنجائش کا تھا۔ ڈیڑھ سو سے زیادہ مسافر نہ تھے۔ راستے میں کھانا تو دیا گیا مگر وہ "ہمارے کھانے" کا نہ تھا۔ ہم نے ----- "کوک اور کافی" کو کافی سمجھا۔ مونگ پھلی کے بھنے ہوئے مغز تقسیم کئے گئے۔ تو ہم نے ایک کے بجائے چار "تھیلیاں" اٹھا لیں۔ وہ ٹھونگتے رہے۔ ایک فلم بھی دکھائی جا رہی تھی۔ اس کی کمائی تو ہمارے پلے نہ پڑی مگر گھوڑوں کے ساتھ دوڑتے دوڑتے "پٹس برگ" پہنچ گئے۔ جہاں ہمیں اسی ہوائی کمپنی کا دوسرا جہاز پکڑنا تھا۔ جہاز سے نکلے تو مسافروں کے ایک سیلاب کو بھاگتے پایا۔ وحشت ہوئی کیا معلوم اس سیلاب میں بہتے بہتے کہاں جا نکلیں۔ یا اللہ کیا امریکہ میں چھوٹے شہر ہوتے ہی نہیں۔ فضائی سفر میں اپنی پرواز کا گیٹ نمبر کا جاننا بہت ضروری ہوتا ہے۔ امتنان نے ہمیں ڈیور میں بتا دیا تھا کہ "پٹس برگ" میں اگلی پرواز کے لئے ہمارا گیٹ نمبر 34 تھا۔ نمبر تو ہم نے ٹھیک ٹھیک یاد رکھا لیکن ہجوم کے بہاؤ میں ایک زینہ غلط اتر گئے۔ بہر حال شکر کہ سابقہ تجربہ کچھ کام آگیا کہ پوچھتے پاچھتے گیٹ نمبر 34 آ ہی گیا۔ "شکر" اس لئے کہ جہاز اڑنے کے لئے جیسے ہمارا انتظار کر رہا تھا

"پٹس برگ" ہم ساڑھے تین گھنٹے میں پہنچے تھے۔ اگلے سفر میں ابھی چائے کی ایک پیالی ہی چکی تھی۔ کہ "ویسٹ رائیٹ" پر اترنے کا اعلان گونجنے لگا۔ گویا جی بھر کے نئے ہوائی جہاز کو "دیکھنے" کی مہلت ہی نہ ملی۔ چڑھتے ہی اترنے لگے۔ یوں لگا کہ ایک گھنٹہ ----- آدھے گھنٹے میں گزر گیا۔ غالباً دیکھنے کے لئے بہت کچھ تھا۔

"ویٹ رایت" میں رات کے ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ گھڑیاں ---- ڈیور کے وقت سے دو گھنٹے آگے تھیں۔ ہم ہوائی جہاز کی "سرنگ" سے نکلے ہی تھے کہ ایک شخص اسلام علیکم کہکر ہم سے لپٹ گیا۔ یہ سردار علی انصاری تھے۔ نیویارک میں حیرا سے ان کا نام سن کر تو ہمارے ذہن میں سابقہ شناسائی کی کوئی لکیر نہیں ابھری تھی۔ مگر اب جو ان کو دیکھا تو محسوس ہوا کہ اگر وہ ہمیں پہچاننے میں پہل نہ کرتے تو ہم ان کو پہچان لیتے۔ یہ تو ہمارے راولپنڈی کے جانے پہچانے۔ مزدور لیڈر تھے کئی جلسوں جلوسوں کے اور ہڑتالوں کے زعیم۔ ایک خوش پوش و خوش چہرہ نوجوان ان کے ساتھ تھا۔ آپ "ڈاکٹر سید سردار علی زیدی" تھے امریکہ کا یہ نامور ڈاکٹر "ویٹ رایت" میں ہمارا میزبان تھا۔ انصاری صاحب کے بقول ان کا تعلق لکھنؤ سے تھا۔ مگر معانقے میں ڈاکٹر صاحب کے "ٹھیے" پر سخت حیرت ہوئی۔ یا اللہ یہ ڈاکٹر زیدی لکھنؤ کے ہیں یا ہمارے جہلم راولپنڈی وغیرہ کے۔ مگر بھئی واہ واہ ڈاکٹر ہو تو ایسا ہی گھٹیلا جھبیلا کہ ہسپتال کے "وارڈ" سے زیادہ فوج کی "بارک" میں سوہے۔ ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ محترمہ بھی ایئر پورٹ پر تشریف لائی تھیں۔ نہایت ہی شائستہ خاتون۔ مشرقی تمدن کا نمونہ۔ نیویارک سے حضرت محشر بدایونی اور جناب سرشار صدیقی کی آمد ہم سے پہلے متوقع تھی۔ مگر ان کا ہوائی جہاز نیویارک کی زمین کو چھوڑنے پر ہی آمادہ نہ ہوا۔ ہم پہنچے تو ادھر سے بھی خبر آگئی کہ انشاء اللہ کل صبح پہنچیں گے۔

ڈاکٹر زیدی صاحب کا گھر بہت ہی کشادہ اور بہت ہی خوبصورت ہے۔ دروازے تو شائد ڈاکٹر صاحب کے قدموں کی چاپ کو پہچانتے تھے کہ خود بخود ہی کھلتے چلے گئے ---- "ڈرائینگ روم" سے ملے ہوئے "طعام جھروکے" پر ایک اور خاتون نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ چند ہی لمحوں میں اندازہ ہو گیا کہ انتہائی شائستہ ہونے کے علاوہ یہ خاتون اردو شاعری کو بھی اوڑھنے بچھونے کی طرح استعمال کرتی ہیں۔ ہمارے لئے کھانا نکالتے ہوئے جو چیز بھی دیگچی میں سے نکالی اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی تابدار شعر بھی دیگچی سے نکال لاتیں۔ آپ تھیں محترمہ فرحت منظور صاحبہ۔ ڈاکٹر زیدی کی ہمشیرہ وہ کراچی میں بیاہی ہوئی ہیں۔ ان دنوں یہاں بھائی بھاوج سے ملنے آئی ہوئی ہیں۔ بھائی ہندوستانی ---- بہن پاکستانی۔ مولانا چراغ حسن حسرت کا ایک شعر یاد آگیا۔

دریائے الفت طوفاں پہ طوفاں
ہم اس کنارے تم اس کنارے

کھانا بہت عمدہ ملا ---- کئی چیزیں تھیں۔ جن پر سے گزرتے گزرتے یعنی (کھاتے) ہم لکھنؤ اور کراچی سے ہوتے ہوئے لاہور پہنچ گئے۔ کھانے کے بعد تھوڑی سی گپ شپ کے بعد شب خوابی کے لئے نچلی منزل میں اپنے کمرے میں چلے گئے۔ کمرہ کسی ---- "پانچ اسٹار ہوٹل" کی آسائشوں سے آراستہ تھا۔ مگر یہ دیکھ کر حیرت ہوئی اس منزل میں غسل خانہ غالباً ایک ہی ہے اور وہ بھی کمرے سے باہر ایک دوسرے کمرے کی "کمر" سے لگا ہوا ہے۔ جہازی دو منزلہ پلنگ کے سرہانے تپائی پر دیوان غالب کا نسخہ بھول رکھا ہوا تھا۔ کچھ دیر تک میرزا کے اشعار نے سونے نہ دیا۔

(4 نومبر)

○

بساطِ بشاشت

عنایت علی خان

نالائق

مرے سکول سے لیجائیں اپنے بچے کو
جو کام دیں یہ اُسے غلط سلط کرتا ہے
اسے تو ٹھیک سے اردو تلک نہیں آتی
لَفظؔ لَفظؔ کا تو مُتلفَظؔ یہ غلط کرتا ہے

وسعتِ نظّارہ

کبھی آتی ہے لیڈی ڈاکٹا یارا!
کبھی جرمن کبھی روسی حسینہ!
ابے او بین الاقوامی نظر باز!
یہ تیرا دل ہے یا ڈش انٹینا!

قبلۂ ثالث

کبھی دیکھتے تھے جو تفسیرِ قرآں
وہ اب دورِ نو کی پھبن دیکھتے ہیں
لگائی ہے لو جب سے امریکیوں سے
مُنَنْ کی جگہ سی این این دیکھتے ہیں

○

کلیم چغتائی

افسرِ سرکار ہونا چاہیے
ٹھاٹ سے دفتر میں سونا چاہیے
امتحاں میں کامیابی کے لئے
کوئی جادو، کوئی ٹونا چاہیے
رعب سے محروم ہے اردو زباں
اس میں انگریزی پرونا چاہیے
ہے گرانی کا وہ عالم، الاماں
اب روپوں کی فصل بونا چاہیے
دودھ کے بزنس میں چاندی ہے بہت
اب مجھے جی بھر کے "سونا" چاہیے
گول چیزوں سے الرجی ہے انہیں
دائرہ بھی اب تکونا چاہیے
آپ کا مضموں تکاہی ہے مگر
اس کے ہر فقرے پہ رونا چاہیے
آپ کے دیوانِ طولانی کو اب
ایک مصرع میں سمونا چاہیے
اہلیہ گھر میں نہیں ہیں آج تو
بازیِ شطرنج ہونا چاہیے
وہ زمانہ ہے کہ اب تو نیکیاں
کر کے دریا میں ڈبونا چاہیے

ادارہ محترمہ شبنم شکیل صاحبہ کے گوشے سے چہار سو کو رونق بخشنے کا آرزو مند تھا محترمہ نے خود کو اس اعزاز کے لئے کیوں مناسب و موزوں نہ جانا یہ جاننے کے لئے ہم نے انہیں زحمت ملاقات دے ڈالی ہم یہ نہیں کہتے کہ شبنم شکیل صاحبہ نے اردو شاعری کو نیا لہجہ اور منفرد اسلوب بخشا کیونکہ یہ ہمارا مقام نہیں البتہ ہم یہ ضرور عرض کریں گے کہ شبنم شکیل صاحبہ نے زندگی کے رویّوں کو تمام تر سلیقگی اور رعنائی کے ساتھ سینے سے لگایا ہوا ہے شاعری کے بعد سب سے بڑی خوبی ان کا سادہ اور پر خلوص رویہ ہے۔ جس نے انہیں اپنوں کے ساتھ بیگانوں میں بھی ہردلعزیزی کے مقام پر فائز کر رکھا ہے یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ زیر نظر ملاقات فقط شبنم صاحبہ سے نہیں بلکہ موقع غنیمت جان کر ہم نے تمام اہل خانہ کے تھوڑے سے وقت کو چہار سو کے لئے وقف کر لیا ہے۔

ملاقات — عطیہ افروز

لہو اس دل سے اب رستا نہیں ہے
یہ میرے واسطے اچھا نہیں ہے
خود اپنا ساتھ کب تک دے سکوں گی
یہ میں نے آج تک سوچا نہیں ہے
خوشی کا تاج واپس کر دیا ہے
یہ میرے سر پہ کچھ جچتا نہیں ہے
مجھے جانا ہے جس کو پار کر کے
ابھی رستے میں وہ دریا نہیں ہے
کھڑی ہوں کب سے میں کشکول تھامے
مگر بابِ ہنر کھلتا نہیں ہے

محترمہ شبنم شکیل صاحبہ

☆چونکہ صنف نازک سے تاریخ پیدائش پوچھنا مناسب نہیں فقط جائے پیدائش اور تعلیم و تربیت کے بارے میں کچھ بتایئے؟

★میں "لاہورن" ہوں میری تعلیم و تربیت اسی شہر میں ہوئی۔ اورینٹل کالج سے اردو میں ایم۔اے کرنے کے بعد کوئین میری کالج میں پڑھانا شروع کر دیا۔ باقی ماندہ زندگی درس و تدریس میں ہی گزاری۔ شوہر کی ملازمت کی وجہ سے پاکستان کے ہر صوبے میں رہی اور ہر بڑے کالج میں پڑھایا۔ مگر لاہور سے اپنی وابستگی کو اپنی شخصیت کے حوالے سے بہت اہم جانتی ہوں۔ اسی لئے کہتی ہوں۔

"لاہور پیچھے رہ گیا ہم باوفا مگر
اس شہرِ بے مثال سے آگے نہیں گئے"

☆پہلا شعر کس عمر کس سبب اور کہاں کہا؟

★پہلا شعر اٹھارہ برس کی عمر میں کہا۔ ریڈیو پر طلبا کا ایک پروگرام ہوتا تھا "یونیورسٹی میگزین" اسی میں پڑھا کہا بھی ریڈیو والوں کے کہنے پر۔ ویسے مجھے

معلوم تھا یہ پہلے سے ہی کہ میں شاعر ہوں مگر میں شاعری نہیں کرنا چاہتی تھی اس کی کچھ وجوہات تھیں انہیں بتانے کا یہ موقعہ نہیں ہے کیونکہ پھر بہت تفصیل میں جانا پڑے گا۔

☆شاعری عطیہ خداوندی ہے یا والد مرحوم کا فیض؟

★میں تو سمجھتی ہوں کہ ہر شے عطیہ خداوندی ہے۔ اگر عابد صاحب کی بیٹی ہونے کی وجہ سے مجھ میں بھی شاعری در آئی تو یہ بھی قدرت کی طرف سے تھا۔ ورنہ ہم سات بہن بھائی تھے وہ سب کے سب شاعر ہوتے۔ البتہ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ گھر کا ماحول شاعری کے لئے بہت سازگار تھا۔

☆والد مرحوم کے علاوہ کن شعرا سے کسب فیض کیا کسی کو باقاعدہ استاد مانتی ہیں؟

★ابتدا میں عابد صاحب کبھی کبھار میرے شعروں کی اصلاح کیا کرتے تھے۔ شادی کے بعد تقریباً تمام ادبی مشاغل سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی اس لئے یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔ جب دوبارہ شاعری کی طرف رجوع کیا تو احمد ندیم قاسمی صاحب نے میری رہنمائی کی۔ اب بھی کرتے ہیں۔ اپنے نئے مجموعہ کلام "اضطراب" کا مسودہ سنگ میل والوں کو اشاعت کے لئے دینے سے پہلے ان کو دیا تھا تاکہ وہ ایک نظر اسے دیکھ لیں۔ (آجکل "اضطراب" کتابت کے مراحل میں ہے) جناب ضمیر جعفری صاحب سے بھی مشورہ کرتی رہتی ہوں۔ انکی بھی شکر گزار ہوں۔

☆کیا آپ جز وقتی اور کل وقتی شاعری پر یقین رکھتی ہیں؟ آپ کا شمار کس صف میں ہوتا ہے؟

★جز وقتی اور کل وقتی شاعری کی اصطلاح بھی خوب ہے۔ زندگی محض شاعری تو نہیں۔ بہرحال جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے جز وقتی والوں میں شامل کریں۔ میں نے تمام زندگی ملازمت بھی کی گھریلو ذمہ داریاں بھی نبھائیں۔ اپنا حال تو یہ ہے۔

"میرے پاس تو اپنے لئے بھی اکثر کوئی وقت نہ تھا
ہاں جو فراغت کے لمحے تھے تیری یاد کے نام رہے"

☆شعر کہنے کے لئے کس قسم کی فضا اور ماحول کی ضرورت محسوس کرتی ہیں؟

★شاعری میں ظاہر کی فضا اور ماحول سے زیادہ ذہنی فضا کا عمل دخل ہوتا ہے۔ اس کے لئے اپنے ذہن کو Conditioned کرنا پڑتا ہے۔ جہاں یہ گرفت کمزور پڑی وہیں شاعری بھی ناراض ہوئی۔ شاعری بلا کی حاسد چیز ہے۔ اب آپ خارجی ماحول اور فضا کا جواب بھی ضرور مانگتے ہیں تو سنیئے اس کے لئے مجھے ایک "لاتعلقی" کی فضا چاہیے۔ خواہ وقتی طور پر سہی۔ شاعری کے موڈ میں انسانوں کے درمیان رہ کر ان سے دور رہنا چاہتی ہوں۔ یہ ایک ایسی کیفیت ہے جسے تمام فنکار خوب سمجھتے ہیں۔ زیادہ تشریح کی ضرورت نہیں۔

☆کیا آپ زنانہ اور مردانہ شاعری پر یقین رکھتی ہیں؟

★جی نہیں میں اسکی قائل نہیں۔ یہ بحث ویسے بھی بہت پرانی ہو چکی۔ عورت اور مرد پہلے تو انسان ہیں میں دونوں کو اسی تناظر میں دیکھتی ہوں۔ میری اپنی شاعری بھی ایک "فرد" کی شاعری ہے۔ میری خواہش ہے کہ عورتوں کو بھی انسان سمجھا جائے۔ عورت مرد کا لیبل لگانے سے پہلے۔

☆کس صنف میں طبع آزمائی کرکے تسکین حاصل ہوتی ہے؟

★پوری طرح سے تسکین ہوتی ہی نہیں لکھنے والے کی اسی لئے لکھتا رہتا ہے۔ میں صرف شاعری ہی نہیں کرتی بلکہ افسانے بھی لکھ رہی ہوں مضامین بھی لکھتی رہتی ہوں۔ شاعری میں بھی کسی ایک صنف سخن تک محدود نہیں رہ سکتی۔ پس جو خیال ذہن کو گرفت میں لے لیتا ہے وہ اپنی شکل بھی خود ہی متعین کرلیتا ہے۔

☆اردو شاعری میں ہونے والے تجربات سے آپ کو اتفاق ہے یا اختلاف؟

★نئے تجربات تو ہر شعبے ہی میں خوش آئند امر ہیں۔ شاعری اس سے مستثنیٰ کیسے رہ سکتی ہے۔ وقت کی بھٹی میں چڑھنے کے بعد کھرا کھوٹا خود ہی ثابت ہو جاتا ہے البتہ نئے تجربات کو پرانے تجربات کی روشنی میں پرکھنے کا عمل بہت ضروری ہے۔ روایت کا مکمل شعور اور آگاہی بنیادی شرط ہے۔ اس سے طاقت اخذ کئے بغیر نئے تجربے کی سالمیت مشکوک ہو جاتی ہے۔

☆مدیر "چہار سو" کی جانب سے گوشے کی دعوت پر آپ کا ردعمل کیا ہے؟

★میں ان کی شکر گزار ہوں کہ وہ میرے لئے ایک گوشہ مختص کرنا چاہتے ہیں۔ مگر میں اپنے آپ کو اس اعزاز کے قابل نہیں سمجھتی۔ اگر اس کو شیخی نہ سمجھا جائے تو کہوں کہ کئی رسالے مجھ سے اس سلسلے میں رابطہ کرچکے ہیں مگر میرا خیال ہے کہ مجھ سے سینئر اور بہتر لکھنے والے بہت سے موجود ہیں یہ حق پہلے انہیں کا بنتا ہے۔ یقین کیجئے کہ میں شہرت کی نہیں عزت کی طالب ہوں صرف اتنی سی دعا مانگتی ہوں کہ خدایا مجھے اچھا لفظ لکھنے کی توفیق دے تاکہ خود میری اپنی نظروں میں میری کچھ عزت بن جائے۔ اپنے اشعار میں بھی یہ بات اکثر کہتی رہتی ہوں۔

محترم شکیل صاحب

☆شکیل صاحب آپ کا آبائی تعلق کہاں سے ہے تعلیم و تربیت کہاں حاصل کی؟

★میرا آبائی شہر میرٹھ ہے ابتدائی تعلیم انڈیا سے حاصل کی۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ چلا گیا۔

☆بیورو کریسی کا حصہ کب اور کیسے بنے؟

★میں انڈیانا یونیورسٹی (امریکہ) میں انگریزی ادب میں ڈاکٹریٹ کر رہا تھا مگر والد صاحب کا اصرار تھا کہ میں سول سروس کا امتحان دوں چنانچہ میں نے وہیں تیاری کی اور 1963ء میں برطانیہ سے پاکستان سول سروس کا امتحان دیا 1964ء میں منتخب ہو کر اس سروس سے وابستہ ہو گیا۔

☆عوام تو افسر شاہی سے خاصے شاکی ہیں افسر شاہی کا عوام کے بارے میں کیا تاثر ہے؟

★عوام بیورو کریسی سے بالکل ٹھیک شاکی ہیں۔ افسر شاہی ہمارے ہاں عوام کو جواب دہ نہیں اور یہی بنیادی خرابی ہے۔ عوام کے دیئے ہوئے ٹیکسوں سے افسر شاہی کو تنخواہ ملتی ہے مگر ٹیکس ادا کرنے والے کو یہ حق نہیں دیا گیا کہ وہ بیورو کریسی کا احتساب کرے جب تک یہ Concept اوپر سے لیکر نیچے تک یعنی نوکر شاہی یا افسر شاہی میں داخل نہیں ہو گا لوگ اس سے شاکی رہیں گے۔ البتہ ایک بات کہنا چاہتا ہوں کہ عوام کا واسطہ زیادہ تر بڑے افسروں سے نہیں پڑتا نچلی سطح پر رہتا ہے چنانچہ انہیں شکوہ بھی زیادہ وہیں ہوتا ہے۔ غیر ذمہ داری وہاں زیادہ ہے۔

☆کیا آپ کو یاد ہے شبنم سے ملاقات کب اور کیسے ہوئی؟

★شبنم میری ہمشیرہ کی بہت گہری سہیلی تھیں۔ ہم لوگوں کا آنا جانا رہتا تھا۔ اس لئے یہ تو یاد نہیں رہا کہ پہلی ملاقات کیسے اور کب ہوئی البتہ غالباً 1961ء یا 1962ء میں ہم لوگ ایک دوسرے کے خاندان سے متعارف ہوئے تھے۔

☆شعر و ادب سے کس حد تک لگاؤ ہے؟

★میں انگریزی ادب کا بہت معترف ہوں تاہم دوسری زبانوں کے ادب سے بھی لگاؤ ہے۔ اردو ادب بھی انہیں میں شامل ہے۔ ملازمت میں آنے کے بعد ایک بے فیض سرکاری ماحول میں رہتے ہوئے شعر و ادب سے لگاؤ رکھنا خاصا مشکل ہو گیا۔ وہ یوں کہ میں دیکھتا ہوں کہ یہاں ہر طرف ایک Ratrace لگی ہوئی ہے لوگ مادی سہولتوں اور اگلے گریڈ کے لئے تمام خوبصورت جذبوں کی نفی کر رہے ہیں۔ پھر بھی میں نے اپنے آپ کو شعر و ادب سے بالکل جدا نہیں ہونے دیا شائد اس لئے میں اس سرکاری Setup میں Misfit بھی ہوں۔

☆بیگم کے علاوہ پسندیدہ شاعر و شاعرات کے چند نام بتایئے؟

★اردو شاعری کے حوالے سے میں غالب اور فیض کو بہت خوش دلی سے پڑھتا ہوں

☆اعلیٰ عہدے کی ذمہ داریاں بھی اہم ہوتی ہیں جبکہ بیگم ماہر تعلیم اور معروف شاعرہ ہیں گھریلو ذمہ داریوں کا بار کس کے کاندھوں پر ہے؟

★تمام تر گھریلو ذمہ داریاں تقریباً شبنم کے کاندھوں پر ہیں جس میں میری اور بچوں کی ذمہ داریاں بھی شامل ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں ایک Demanding انسان ہوں اور ان تمام امور کی وجہ سے شبنم اپنی شاعری پر اتنی توجہ نہیں دے سکی جتنی دینی چاہیے تھی۔ اس میں بہت Potential تھا جو وہ Exploit نہیں کر سکی۔ جہاں تک ادبی مشاغل کا تعلق ہے۔ میں اس بات کا گواہ ہوں کہ وہ دوسرے ممالک سے آئے ہوئے اکثر دعوت ناموں کو مسترد کر دیتی ہیں۔ تاکہ ہم لوگوں کو کوئی گھریلو پریشانی نہ اٹھانی پڑے۔

☆دو زبانوں کے ملاپ سے گھر میں کس طرح کا کلچر عام ہوا اس نے بچوں پر کس قسم کے اثرات مرتب کئے

★اردو اور پنجابی زبان کے تال میل سے اور دو ثقافتوں کے امتزاج سے گھر میں ایک خوبصورت تہذیبی فضا پروان چڑھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی روایت کا احترام کرتے ہیں۔ مگر یہ بھی کوشش کرتے ہیں کہ اپنی اپنی غلط روایات کو فروغ دینے سے اجتناب کریں۔ بچے سمجھدار ہیں اس لئے دونوں ثقافتوں کی کمزوریوں کی نشاندہی کرتے رہتے ہیں۔ بہت لطف رہتا ہے۔

☆میل شاعر حضرات کی بیگمات اکثر گلہ کرتی ہیں کہ میاں کو آمد ہوتے ہی پیٹ میں درد ہونے لگتا ہے ''دیکھئے'' بیچ رات تازہ کلام سنانے پر بضد ہو جاتے ہیں۔ آپ کے ہاں کیا کیفیت ہے؟

★نہیں ایسا نہیں ہوتا۔ میری فرمائش پر کبھی کبھار شعر سنا دیتی ہیں۔ کبھی کبھی غائب دماغ ہو جاتی ہیں سوال کا جواب بھی ٹھیک نہیں دیتیں مگر کیا ہو سکتا ہے ''اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔''

☆کبھی ایسا موقع بھی آیا جب آپ نے شبنم کی شہرت و ناموری سے جیلسی فیل کی ہو؟

★میں نے خود بھی ایک بھرپور زندگی گزاری ہے۔ اور مجھے زندگی میں اہمیت بھی ملتی رہی ہے۔ شائد اس وجہ سے مجھے حسد کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی آپ شبنم سے پوچھ سکتے ہیں کہ گھر پر ادبی محفلیں برپا کرنے میں ان سے زیادہ میرا حصہ ہوتا ہے۔ میں تو خوش ہوتا ہوں رونق دیکھ کر۔

تین بچے تین سوال

☆ممی ڈیڈی میں سے آپ کا آئیڈیل کون ہے؟

☆آپ کی شخصیت پر کس کا اثر زیادہ ہے؟

☆ممی کی شاعری سے انجوائے کرتے ہیں یا بور ہوتے ہیں؟

پرسکون
گھر کے
باشعور مکیں

وقار حسین احمد

★جہاں تک Ideal کا سوال ہے۔ وہ شعوری طور پر تو کوئی نہیں۔ لیکن غیر شعوری طور پر اگر کچھ ہو تو کہا نہیں جا سکتا۔

★اثر والدین کے تجربے کی حد تک ہے۔ زندگی میں انہوں نے جو کچھ دیکھا ہے اور جن تجربات سے وہ گزرے ہیں۔ اگر وہ ہمارے ساتھ Share کرتے۔ ہیں تو ظاہر ہے اسکا اثر ضرور ہوتا ہے۔

★امی کی شاعری بالکل اسی طرح انجوائے کرتا ہوں جس طرح ایک پڑھا لکھا شخص Enjoy کرتا ہے۔

جہاں زیب

★میں سمجھتا ہوں کہ آئیڈیل ستاروں کی طرح ہوتے ہیں آپ وہاں تک پہنچ نہیں سکتے مگر وہ آپ کو اپنا راستہ تلاش کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ اس لئے میں اپنے والدین کو تو اپنا آئیڈیل نہیں سمجھتا۔ بلکہ میرا آئیڈیل ڈاکٹر عبدالسلام ہیں اور میں ان ہی کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کروں گا۔

★لاشعوری طور پر اگر میری شخصیت پر میرے والدین کا اثر ہو تو میں کہہ نہیں سکتا مگر شعوری طور پر اگر میں نے کسی سے اثر لینے کی کوشش کی ہے تو وہ Burt land russell ہے۔

★اپنی والدہ کی شاعری کو بالکل کسی غیر متعلقہ شاعر کی شاعری کے طور پر پڑھتا ہوں۔ اگر اچھی لگے تو ضرور Enjoy کرتا ہوں۔

مس ملاحت احمد

★Ideal تو شاید دونوں میں سے کوئی بھی نہیں ہے۔ البتہ دونوں سے Inspiration ضرور ملتی ہے۔

★والدین کا بچوں پر اثر ہونا تو ایک فطری بات ہے۔ چاہے یہ اثر Consciously ہو یا Unconsciously میں اتنا ضرور کہوں گی کہ میں اپنے آپ کو بہت Priviliged سمجھتی ہوں کہ میں ایک پڑھے لکھے گھر میں پیدا ہوئی۔ جہاں کا ماحول بہت Congenial اور Stimualating ہے۔

★امی کی وجہ سے ہمارے گھر کا ماحول کافی ادبی ہے اور مجھے ویسے بھی ادب پڑھنے کا شوق ہے چنانچہ امی کی شاعری شوق سے پڑھتی اور سنتی ہوں۔

"JUSTICE DELAYED"

(شبنم شکیل)

میری تار تار محبتیں
میری دل فگار محبتیں
میری بے وقار محبتیں
میری بار بار محبتیں
سبھی مستعار محبتیں
جو اُجڑ سکیں نہ پنپ سکیں
سرِ شاخِ دل نہ سجا کبھی
کوئی لحہ کھلتے گلاب سا
سرِ بابِ جاں نہ رقم ہوا
کوئی سانحہ کوئی المیہ
میری بے یقین محبتیں
کہ عطا ہوا انہیں دہر میں
نہ شرف ہی شہرتِ عام کا
نہ سند ہی کوئی دوام کی
نہ وصال میں کوئی سرخوشی
نہ تو شدتِ غمِ ہجر ہی
جو گریزاں ان سے صعوبتیں
سبھی راحتیں بھی تھیں اجنبی
نہ رقابتوں میں خلوص تھا
نہ تھیں استوار رفاقتیں
کسی قید میں کسی جبر میں

رہیں کور چشم بصارتیں
سو کتابِ جاں کی عبارتیں
نہ سیہ ہوئیں نہ سفید ہی
وہی ایک رنگ تھا سرمئی
وہ جو پیرہن کا ہے شام کے
یونہی عمر ساری گزر گئی
کسی سر کشیدہ سوال میں
کسی خواب کے سے خیال میں
کسی خوف جیسے ملال میں
اِک عجب سی صورتِ حال میں
میری بدنصیب محبتو
میری ایک بات یہ جان لو
کبھی معتبر بھی جو ہو گئیں
اسی زندگی ہی میں تم اگر
تو یہ دیر یاب خوشی مجھے
نئے دکھ سے کر دے گی آشنا
میں کہاں سے ڈھونڈھ کے لاؤں گی
وہ خوشی برتنے کا ذوق و شوق
جسے وقت لے کے بھی جا چکا

نذرِ اقبال
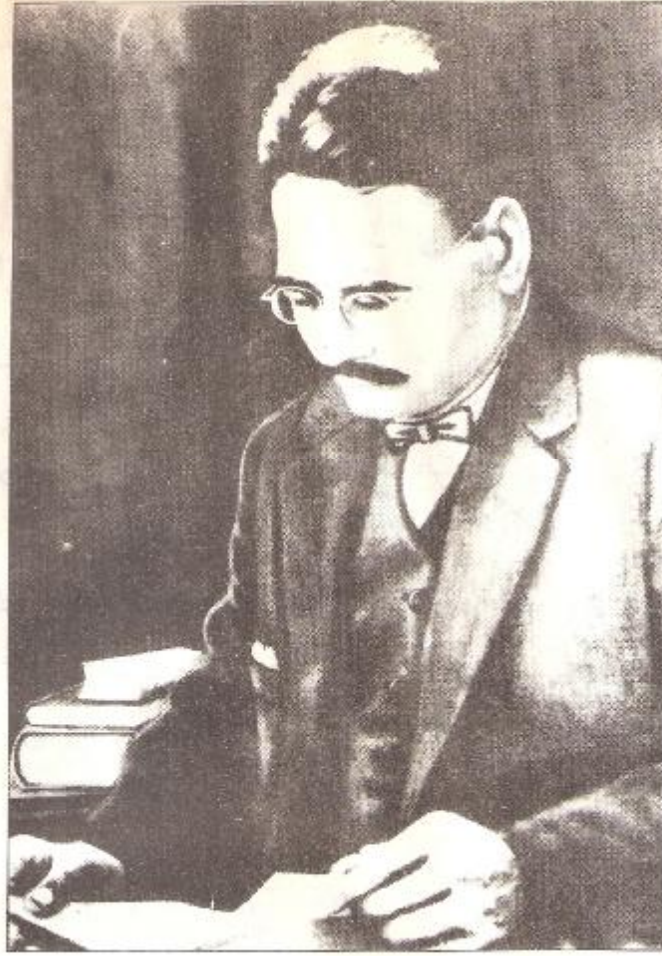
ناصر زیدی

ملی نگاہ مگر فرصتِ نظر نہ ملی ------ اقبالؒ

دل و نگاہ کو تسکین عمر بھر نہ ملی
سفر کا شوق مِلا، منزلِ سفر نہ ملی

ترے بغیر کلی دل کی کس طرح کھلتی
خزاں کی زد میں بہاروں کی کچھ خبر نہ ملی

زمانہ حسن کی تصویر بن گیا، لیکن
تلاش جس کی تھی وہ صورتِ بشر نہ ملی

بس ایک بار ملی اُس کی رہگزر مجھ کو
پھر اُس کے بعد کوئی اور رہگزر نہ ملی

مری حیات میں مہتاب بن کے آجاؤ!
ملی جو مہلتِ شب آج، کل اگر نہ ملی

حریمِ ناز پہ موقوف کچھ نہیں، ناصرؔ!
کہاں کہاں پہ فغاں مجھ کو بے اثر نہ ملی

ممتاز مفتی کی تصانیف

۱	لبیک	(روداد حج)	طباعت کے حقوق عام کر دیے گئے
۲	پیاز کے چھلکے	(شخصیات)	میشنل پبلشنگ ہاؤس
۳	علی پور کا ایلی	(ناول)	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
۴	الکھ نگری	(")	" " " "
۵	ان کہی	(افسانے)	" " " "
۶	اوکھے لوگ	(شخصیات)	ہجرہ انٹرنیشنل لاہور
۷	مفتیانے	(افسانوں کی کلیات)	فیروز سنز
۸	روغنی پتلے	(افسانے)	" "
۹	کہی نہ جائے	(")	" "
۱۰	سمے کا بندھن	(")	" "
۱۱	اسمارائیں	(")	" "
۱۲	گڑیا گھر	(")	" "
۱۳	چپ	(")	" "
۱۴	اور اوکھے لوگ	(شخصیات)	" "
۱۵	ہندیاترا	(سفرنامہ ہند)	" "
۱۶	رام دین	(مجموعہ مضامین)	" "
۱۷	اوکھے اولڑے	(شخصیات زیر طبع)	" "
۱۸	منہ زبانیاں	(مجموعہ مضامین زیر طبع)	" "
۱۹	نظام سقہ	(اسٹیج ڈرامے)	" "

اندھیرے سویرے

جگن ناتھ آزاد کا اعزاز

حکومت ہند نے برصغیر کے ممتاز شاعر اور دانشور پروفیسر جگن ناتھ آزاد کو بھارت کی "انجمن ترقی اردو" کا صدر مقرر کیا ہے قومی احترامات میں بھارت میں یہ منصب (جھنڈے کے بغیر) وفاقی وزیر کے برابر ہوتا ہے۔

عالمی اردو کانفرنس

6 سے 9 ستمبر تک کراچی میں عالمی اردو کانفرنس منعقد ہوئی جس میں دنیا کے 14 ممالک کے مندوبین نے شرکت کی۔ بھارت سے جگن ناتھ آزاد' پروفیسر قمر رئیس' اور ڈاکٹر شہریار۔ برطانیہ سے ڈیوڈ میتھیوز اور ساقی فاروقی' چین سے ٹی شاں (انتخاب عالم)۔ اور وسطی ایشیا کی سابق روسی مملکتوں کے علاوہ یورپ کے بعض ملکوں کے اہل قلم نے اپنے اپنے ملکوں کی نمائندگی کی۔ اس عظیم الشان کانفرنس کا اہتمام جناب سید شوکت زیدی اور "ایلیٹ کالج" میں ان کے رفقا نے کیا۔

امریکہ میں بین الاقوامی مشاعرہ اور سیمینار بیاد حبیب جالب

یونائیٹڈ مشاعرہ کمیٹی گریٹر نیویارک کے تعاون سے حلقہ فن و ادب شمالی امریکہ نے پاکستان کے معروف عوامی شاعر جناب حبیب جالب کی یاد میں ایک بین الاقوامی مشاعرہ اور سیمینار کا اہتمام روز ویلٹ ہوٹل نیویارک میں کیا جس میں داخلہ بذریعہ ٹکٹ تھا یہ پروگرام دو ادوار پر مشتمل تھا پہلے دور میں سیمینار اور دوسرے دور میں مشاعرہ شامل تھا پہلے دور کی صدارت پاکستان کے معروف سیاستدان جناب معراج محمد خان نے کی جبکہ مہمان خصوصی جناب مجاہد بریلوی تھے نظامت کے فرائض اشفاق حسین نے انجام دیئے جبکہ خطبہ استقبالیہ سید محمد حنیف اخگر نے پیش کیا۔ سیمینار سے جن مقررین نے خطاب کیا اس میں اشفاق حسین' آغا ذوالفقار۔ محمود شام۔ پروفیسر حسن عابد۔ مجاہد بریلوی اور صدر سیمینار جناب معراج محمد خان شامل تھے۔ معراج محمد خان نے اپنی ایک گھنٹہ کی طویل تقریر میں حبیب جالب مرحوم کے اشعار کے حوالے سے پاکستان کی سیاسی تاریخ کا مدلل اور موثر انداز میں جائزہ لیا۔ معراج محمد خان نے ایک اعلان کیا کہ حبیب جالب مرحوم کے اہل و عیال کو اگر کوئی صاحب مالی امداد دینا چاہیں تو وہ نقد رقم مجاہد بریلوی اور چیک محمد یلسین زبیری کو دے دیں۔ دوسرے دور میں مشاعرہ منعقد ہوا جس کی صدارت معراج محمد خان نے کی جبکہ مہمان خصوصی محمود شام تھے اور نظامت کے فرائض زرین یلسین نے انجام دیئے جن شعرا کرام نے اپنا کلام پیش کیا ان میں محمود شام' پروفیسر حسن عابد' نقاش کاظمی' اشفاق حسین' نسیم سید' حنیف اخگر' عاقل ہوشیار پوری' جوہر میر' ڈاکٹر صبیحہ صبا' طلعت اشارات' خوشنود امروہی۔ زرین یلسین' آزاد لکھنوی' ڈاکٹر شفیق۔ ڈاکٹر تقی عابدی' ڈاکٹر جمال قادری' محمد اعجاز خان' ڈاکٹر انوار قادری' وکیل انصاری' آفتاب قادری شامل تھے۔

ضمیر جعفری ایوارڈ

18 ستمبر93ء کو مڈل اسکول چک عبدالخالق (ضلع جہلم) میں جہاں آج سے 72 برس قبل سید ضمیر جعفری نے پرائمری تعلیم پائی' ضمیر ایوارڈ کی تیسری سالانہ تقریب تقسیم انعامات کا انعقاد عمل میں آیا۔ ایک ہزار روپے کا انعام مڈل امتحان میں اول آنے والے طالب علم' جاوید احمد نے حاصل کیا۔ انعامات "ضمیر فاؤنڈیشن" کے صدر بین الاقوامی شہرت کے پاکستانی سائنس دان اور دانشور ڈاکٹر انور نسیم نے تقسیم کئے۔ جبکہ صدارت ممتاز ماہر تعلیم پروفیسر فضل حسین پرنسپل زمیندار کالج گجرات نے کی۔

ہائی اسکول ساگری کے طلباء نے ضمیر جعفری کے ترانے کورس میں پیش کئے۔ معززین علاقہ کی طرف سے سپاسنامہ ہیڈ ماسٹر صاحب نے پیش کیا۔

تذکرہ کا سکنج

کاسکنج ایک خوبصورت تاریخی شہر ہے۔ یہاں کی علمی' ادبی' سماجی' ثقافتی' تہذیبی' سیاسی اور دینی سرگرمیوں کے بارے میں ایک تفصیلی کتاب "تذکرہ کاسکنج" کے نام سے ترتیب دی جارہی ہے۔ کاسکنج سے تعلق رکھنے والے ادیبوں' شاعروں' صحافیوں کے بارے میں تفصیلی اور معلوماتی مضامین شامل کئے جائیں گے۔ دینی درس گاہوں' تعلیمی مراکز کے علاوہ کاسکنج کے دیگر کوائف کا خصوصی تذکرہ ہوگا۔ ادباء شعرا اور دیگر اکابرین کی تصاویر بھی شامل کی جائیں گی۔

متعلقہ حضرات سے گزارش ہے کہ وہ حسب ذیل پتوں پر اپنے تعاون کے سلسلے میں رابطہ قائم کریں۔

1۔ ناصر کاسکنجوی R/140 عابد ٹاؤن بلاک نمبر2 گلشن اقبال۔ کراچی۔
2۔ ڈاکٹر حسرت کاسکنجوی B-2/137 لطیف آباد نمبر8 حیدر آباد سندھ
3۔ قاری عبدالحمید قادری کاسکنجوی 459۔ ساگر روڈ صدر بازار لاہور چھاؤنی۔ 4۔ صابر کاسکنجوی 3/42 ڈی اسٹریٹ F-6/138 اسلام آباد۔

گلنار آفریں کو صدمہ

معروف شاعرہ اور افسانہ نگار محترمہ گلنار آفریں کے داماد میجر سلطان احمد کار ٹریفک کے حادثے میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم اپنی موٹر میں اوکاڑہ چھاؤنی سے لاہور آرہے تھے۔ ہمیں اس سانحۂ جانکاہ میں محترمہ گلنار آفریں اور دیگر پسماندگان سے گہری ہمدردی ہے۔ (ادارہ)

رس رابطے

محسن بھوپالی

برادر عزیز گلزار جاوید

تازہ شمارہ موصول ہوا۔ اور دہری خوشی کا موجب بنا۔ "قرطاس اعزاز" کی اشاعت کی خوشی اس طرح دوبالا ہو گئی کہ یہ شمارہ آج ہی یعنی 29 ستمبر کو موصول ہوا ہے۔ جو میرا یوم پیدائش بھی ہے چنانچہ بیٹی شمانہ اور بیٹوں نے مل کر اچانک سالگرہ کا اہتمام کیا ہوا تھا۔

گوشے کے سلسلے میں عرض ہے کہ حصہ نظم و نثر کی ترتیب لے آؤٹ اور پھر تصاویر کی موزوں اور مناسب جگہ پر اشاعت غرض یہ کہ ہر طرح سے یہ گوشہ آپ کی ادارتی صلاحیتوں اور حسن ذوق کی آئینہ داری کا مظہر ہے اور میرے لئے ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس پیشکش کے لئے آپ اور آپ کے رفقاء کا ممنون ہوں۔

کمپوزنگ کا معیار بھی پہلے سے بہت بہتر ہو گیا ہے۔ چالیس پچاس صفحات کی کمپوزنگ میں صرف دو ایک جگہ ہی پروف ریڈنگ کی غلطی نظر آئی۔ اگر صحیح مصرع دوبارہ شائع کر دیں تو مناسب رہے گا میرے قطعہ کا پہلا مصرع اس طرح ہے:۔

بجا فرمودہ اقبال میں منکر ہوں کب اس سے

ایک غزل کا دوسرا مصرع غلط شائع ہو گیا ہے جس سے مطلب ہی خبط ہو کر رہ گیا ہے۔ پورا شعر اس طرح ہے:۔

میری کمزوریوں سے ہے واقف
میرا بدخواہ مجھ سے بہتر ہے!

اور اب دیگر مندرجات کے بارے میں۔ نیلم احمد بشیر کا افسانہ "ویرانے کی بہار" ایک اچھا افسانہ ہے لیکن میں اسے پہلے بھی "تجدید نو" یا تخلیق میں پڑھ چکا ہوں۔ انجم جاوید کا افسانہ نہایت موثر انداز میں لکھا گیا ہے۔ اس کا اختتام قاری کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے میرے نزدیک یہی ایک مختصر افسانے کا مقصد بھی ہے اور منصب بھی! چند ایک جگہ زبان و بیان کی غلطیاں کھٹکتی ہیں۔ مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں "دونوں باپ بیٹی کی جھڑپ اسے لطف دے رہی تھی" رشتے کا تقاضہ ہے کہ انہیں یہاں نوک جھونک استعمال کرنا چاہیے تھا۔ بہرحال بزم افسانہ میں ایک نوارد کی آمد خوش آئند ہے۔ حصہ نظم میں مناظر عاشق ہرگانوی کی "نظم عصر" کے عنوان سے شائع ہونے والی دونوں نظمیں دراصل "نظم نثر" ہیں! غزلوں میں عمیرا رحمان کی غزلیں تازگی لئے ہوئے ہیں۔ ان کا مطلع:۔

بے لمس ساعت ہے گزرتے ہوئے پل کی
ہم لمحہ موجود میں آواز ہیں کل کی!

بہت بھرپور ہے۔ ایس ایم معین قریشی کا انشائیہ "اسپیک اردو" واقعی بشاشت افروز ہے۔ شاہ جی کا سفرنامہ اس بار بھی نئی دلچسپیاں لئے ہوئے ہے۔

انور سدید

محترمی گلزار جاوید صاحب!

اکتوبر 1993ء کا شمارہ جسے "محسن بھوپالی نمبر" موسوم کرنا مناسب ہے مل گیا ہے۔ اس کرم فرمائی کے لئے شکر گزار ہوں۔ خوشی ہوئی کہ آپ نے محسن بھوپالی کا حق بروقت ادا کیا۔ ایک لحاظ سے اسے پنجاب کا سندھ کو خراج تحسین بھی کہا جا سکتا ہے۔ مجھے آپ کا شکریہ اس لئے بھی ادا کرنا ہے کہ محسن کے اعتراف فن میں آپ نے مجھے بھی شامل کیا۔

گزشتہ شمارہ میں "قرطاس اعزاز" میرزا ادیب صاحب کو پیش کیا گیا۔ اس گوشے میں ان کا جو انٹرویو چھپا ہے وہ میرزا صاحب کے شایان شان نہیں۔ یوں لگتا ہے کہ انٹرویو لینے والے نے میرزا صاحب کی گردن دبوچ رکھی ہے ان سے نہ صرف اہانت آمیز سوالات کر رہا ہے۔ اور میرزا صاحب کے احتجاج کو قبول نہیں کرتا بلکہ ان کی گردن پر اپنے ہاتھوں کی گرفت مزید سخت کر دیتا ہے۔ مجھے علم ہے کہ اس انٹرویو کی مکرر اشاعت ہوئی ہے۔ خدا جانے آپ کی توجہ اس سقم کی طرف کیوں نہیں گئی۔ میرزا ادیب ہمارے سینئر ترین ادبا میں سے ہیں، اور ان کا احترام ہر مقام پر ہونا چاہیے۔ میں "چہار سو" کے ذریعے انٹرویو نگار کے منفی رویے پر اپنا احتجاج درج رجسٹر کرتا ہوں۔ امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ سید صاحب سے سلام عرض کیجئے۔

پروین کمار اشک (پٹھان کوٹ بھارت)

مکرمی! گلزار جاوید

آج تمثال کراچی کے تازہ شمارہ میں آپ اور محترم سید ضمیر جعفری کی ادارت میں نکلنے والے معتبر ادبی ماہنامہ "چہارسو" اشاعت کی خبر پڑھی روحانی مسرت ہوئی۔ اس کے اجراء پر میری دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔

بندہ کو پروین کمار اشک کہتے ہیں! برصغیر میں آزادی کے بعد پیدا ہونے والی نئی نسل کے ممتاز ترین شعراء میں اہل نظر شمار کرتے ہیں! نئی جدید ترین غزل کہتا ہوں! پہلا شعری مجموعہ دربہ در 1980ء میں طبع ہوا تھا جسے مشاہیر نے خوب خوب سراہا تھا اب چند ماہ قبل چاندنی کے خطوط پر دوسرا مجموعہ غزلیات منظرعام پر آیا ہے آپ اور محترم جعفری صاحب کے حضور میں پیش کر رہا ہوں شرف قبولیت عطا فرمائیں۔

اکبر حمیدی

تازہ "چہارسو" میں "مگر تو برا نہ مانے" کے صفحات میں پاکستانی سیاست اور جمہوریت کے بارے میں مضمون حرف بحرف درست ہے خدا کا شکر ہے کہ ادب کے فورم سے کسی نے تو ملکی سیاست پر تنقید کی اور اس کی بجرویوں کا نوٹس لیا ورنہ ہمارے ادیب شاعر تو نظمیں اور افسانے لکھ کر سمجھ لیتے ہیں کہ بس اب وہ فارغ ہو گئے۔ گلزار جاوید صاحب اس وقت ضرورت ہے کہ اہل قلم ایک مشترکہ فورم بنائیں اور اس فورم سے اپنا سیاسی کردار ادا کریں اور اس ملک کے لوگوں کو بے یار و مددگار چھوڑ کر استحصالیوں کے رحم و کرم پر نہ ڈال دیں۔ آپ مبارک باد کے مستحق ہیں کہ آپ نے اس کام کا آغاز کیا۔

اشفاق ورک

ماہ اکتوبر کا "چہارسو" ملا۔ ہمیشہ کی طرح زبردست' محسن بھوپالی صاحب کے فن اور شخصیت کا بھرپور احاطہ کیا گیا ہے۔ ایس - ایم - معین قریشی کا مضمون بہت خوب ہے بقیہ تمام تحریریں معیاری ہیں۔ اس پرچے کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں بیک وقت نعیم صدیقی' احمد ندیم قاسمی اور وزیر آغا کی تحریریں شائع ہوتی ہیں۔ اس سلسلے میں آپ یقیناً مبارکباد کے مستحق ہیں۔

شاہد رضوی (نیو جرسی) امریکہ

گلزار جاوید صاحب!

"چہارسو" کا ایک پرچہ غالباً ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب کی کمین گاہ سے نکلا ہوا۔ ہمیں بھی مل گیا۔ پسند آیا۔ یہاں کے "کشمیر ریستوران" میں دنیا بھر کے اردو رسالے آتے ہیں۔ مگر شائد آپ نے ان سے رابطہ نہیں کیا۔

ڈاکٹر خالد حمید (اوہیو امریکہ)

میرے دفتر کا پتہ تبدیل ہو گیا۔ "چہارسو" نئے ایڈریس پر بھجوایا کریں۔ طیور کی زبانی اڑتی ہوئی خبر سنی تھی کہ آپ یورپ کی طرف مائل پرواز تھے۔ اڑتے اڑتے یہاں تک بھی آجایئے کہ یہاں بھی بہت لوگ آپ کے لئے چشم براہ ہیں ——— خدا کرے آپ کی صحت اچھی ہو۔

سجاد مرزا

گلزار جاوید صاحب

محسن بھوپالی پر قرطاس اعزاز ہم سب کے لئے باعث اعزاز ہے۔ آپ نے زندہ پرستی کی ایک قابل فخر روایت کی بنیاد ڈالی ہے آپ نے اب تک جن اہل قلم پر گوشے شائع کئے ہیں۔ دنیائے ادب میں یقیناً ان کا ایک بلند مقام ہے اور وہ اس کا استحقاق بھی رکھتے ہیں۔ اللہ آپ کو مزید توفیقات ارزانی فرمائے۔

△

▽